بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عصرِ حاضر کی مغربی سیاست کا امام' اٹلی کا مشہور مدبر میکیاوَلی ہے۔۔۔اور چونکہ دنیا کی دیگر اقوام پر بھی مغربی افکار وتصورات کا رنگ غالب آ چکا ہے' اس لئے' یوں سمجھئے کہ اس وقت قریب قریب ساری دنیا میں میکیاوَلی سیاست کا دور دورہ ہے۔اس سیاست کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان کو کسی قاعدے اور قانون' اصول اور آئین کا پابند نہیں ہونا چاہئے' بلکہ اپنے مفاد کی خاطر جو حربہ موزوں نظر آئے اسے اختیار کر لینا چاہئے۔

> بادشاہ کے لئے صفت روباہی نہایت ضروری ہے کہ تاکہ وہ دجل وفریب کے جال بچھا سکے.....عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا تھا' وہ باقی نہیں رہیں تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے' لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔.....صحیح حکمت عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے حکمت عملی یہ ہے کہ حسب موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے' اختیار کر لی جائے۔[1]

اس سیاست کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قدر مادی ترقی کے باوجود۔۔۔جس کی نظیر اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔۔۔ساری دنیا جہنم بن رہی ہے' جس میں نہ ایک فرد کو دوسرے فرد پر کوئی بھروسہ ہے۔نہ ایک قوم کو دوسری قوم پر کسی قسم کا اعتماد۔افراد ہوں یا اقوام' سب اپنی اپنی جگہ لرزاں وترساں رہتے ہیں کہ نہ معلوم فریق مقابل۔۔۔پختہ وعدوں اور محکم معاہدوں کے باوجود' جن کی استواری کے لئے وہ اس قدر یقین دلا رہا اور قسمیں اٹھا رہا ہے۔کس وقت کیا کر دے؟ دنیا میں بے اعتمادی' سب سے زیادہ عدم اطمینان کا موجب ہوتی ہے اور جس عالمگیر بے اعتمادی میں دنیا اس وقت گرفتار ہے اس کی مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے اور یہ سب نتیجہ ہے اس میکیاوَلی سیاست کا جس کا سکہ اس وقت ساری دنیا میں رواں ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔''انسان نے کیا سوچا؟'' ص۳۳۔۲۳۲

اس کے مقابلہ میں' سیاست کا ایک تصور قرآن پیش کرتا ہے جس میں ساری دنیا کو علی الاعلان بتا دیا جاتا ہے کہ یہ ہیں ہماری زندگی کے اصول۔ جن میں نہ کبھی تغیر وتبدل ہوسکتا ہے اور نہ ہی ان سے ہم کسی حالت میں انحراف کر سکتے ہیں۔ افراد ہوں یا اقوام' ہم جس سے کوئی وعدہ کریں گے اس سے کبھی نہیں پھریں گے اور جس سے کوئی معاہدہ ہوگا اس میں کبھی دغا نہیں کریں گے۔ خواہ اس میں ہمارا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سیاست کی علمبردار قوم پر دنیا کو کس قدر بھروسہ اور اعتماد ہوگا اور اس سے افراد اور اقوام کس قدر اطمینان کی زندگی بسر کریں گی۔ اس اندازِ سیاست کی حامل قوم کو ''مومن'' کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں۔۔۔ وہ جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکے اور جو امن کا ضامن ہو' یہ کلی بھروسہ اور امن عالم کی ضمانت قرآنی سیاست کا فطری نتیجہ ہے۔

یہ تھی وہ سیاست جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا لیکن وائے بدقسمتی کہ ہمارے ارباب سیاست نے اس مقصد عظیم کو فراموش کر دیا اور جس ڈگر پر باقی دنیا چل رہی تھی انہوں نے بھی اسی پر چلنا شروع کر دیا۔ (یہ ایک جگر خراش حقیقت ہے لیکن ہم اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ زیرِنظر موضوع اس سے الگ ہے۔)

عین اس وقت جب کہ ہمارے ''دنیا دار'' اربابِ سیاست اپنی اپنی مہرہ بازیوں میں مصروف تھے' یہاں ایک آواز بلند ہوئی کہ ہم اس لادینی ماحول میں صحیح دینی سیاست کے جھنڈے گاڑنے کا عزم لے کر اٹھے ہیں آؤ اور ہمارا ساتھ دو۔

میکیاوَلی سیاست کے ستائے ہوئے مسلمانوں نے اس آواز کو نشید رحمت تصور کیا اور اس دعوت دینے والوں کے ساتھ ہو لئے۔ کم وبیش نصف صدی سے اقامت دین کی یہ تحریک ہمارے یہاں کارفرما ہے۔ اس تمام دوران میں اس نے جو کچھ کیا ہے' جب ایک غیر جانبدار مبصر اس پر نگاہ ڈالتا ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے' درویشی بھی عیاری

اس ''مقدس سیاست'' کے یہ خطرات تو کچھ دیر بعد میں جا کر سامنے آئیں گے۔ اس کا ایک اثر ابھی سے اپنے نتائج مرتب کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے غلط معاشرہ میں قوم کی اخلاقی حالت جس قدر پست ہو چکی ہے وہ کسی سے پوشیدہ

نہیں۔ بایں ہمہ، وہ ابھی تک جرم کو جرم اور عیب کو عیب سمجھتے تھے۔ اب جوان کے سامنے یہ ''نئی شریعت'' آئی جس کی رو سے، اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اصول شکنی۔ جھوٹ۔ فریب۔ رشوت۔ سب جائز، بلکہ بعض اوقات واجب، قرار پا گئے تو لوگوں کے دلوں سے احساسِ ندامت بھی بڑھ گیا اور جو کچھ وہ پہلے جھینپے جھینپے سے کرتے تھے اب دھڑلے سے ہونے لگا۔ اس طرح قوم کے دل سے اسلامی اقدار کا احترام بھی ختم ہو گیا اور نوجوانوں کے ذہن میں ''اسلامی حکومت'' کا ایک ایسا تصور پیدا ہو گیا جو دنیا کی لادینی حکومتوں سے کسی صورت سے بھی مختلف نہیں۔ اب وہ بے باکانہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہی ہیں اسلامی معاشرہ کی وہ خصوصیات جن کے تحفظ کے لئے ہم ہندوستان سے الگ ہوئے تھے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے خود نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق ان نوجوانوں کے دل میں جو نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے!

سوچئے کہ یہ نقصانات کس قدر تباہ کن ہیں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یادِ رفتگان

منصور سرمدی

سرسید احمد خان (1818ء تا 1898ء)

﴿انیسویں صدی کا ایک مسلمان رہنما، چشمِ فلک جس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے﴾

انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کا سیاسی، فکری، علمی، معاشی اور معاشرتی زوال اپنے عروج کو چھو رہا تھا۔ مسلمانوں کی حکمرانی ایک قصۂ پارینہ بن چکی تھی اور ان کی زندگی نکبت و ادبار کی گھٹا ٹوپ وادیوں میں بھٹک رہی تھی۔ انہیں علم سے کچھ مس رہ گیا تھا نہ سیاست سے، فکری اعتبار سے وہ کسی قابل رہ گئے تھے اور نہ معاشی اعتبار سے۔ ہر میدان میں وہ پٹ رہے تھے اور ہر طرف سے شکست و ہزیمت ڈھونڈ ڈھونڈ کر مسلمان کے وابستۂ داماں ہو رہی تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی جو ناقص منصوبہ بندی، غلط حکمت عملی، قیادت کے بحران اور نظم و ضبط کے فقدان کے باعث ناکامی سے دو چار ہو گئی، قحط الرجال کی ماری مسلمان قوم کے لئے تازیانۂ قہر ثابت ہوئی۔ انگریز حکومت نے 1857ء کی ''بغاوتِ ہند'' کی تمام ذمہ داری تنہا مسلمانوں کے سر تھوپ دی اور انہیں بدترین انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ سرسید کے اپنے الفاظ میں صورتِ حالات کچھ یوں تھی کہ:

> ''کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ یہ مسلمانوں نے برپا کی۔ خواہ وہ رام دین یا ماتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا، جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا اور کوئی آتشیں بگولہ نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا۔'' (لائل محمڈنز آف انڈیا، سرسید احمد خان)۔

ایسے حالات میں حکمرانوں کی مبغوض ترین قوم کی حمایت میں آواز اٹھانا حقیقت میں اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا لیکن ان بدترین حالات کی موجودگی میں سرسید نے کسی جذباتی نوجوان کے سے ردعمل کا مظاہرہ

نہیں کیا۔ بارگاہ خداوندی سے اسے دور اندیشی، مومنانہ فراست اور فہم و تدبر کی دولت بڑی فراوانی سے عطا کی گئی تھی لہٰذا انہوں نے دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنی قوم کے دفاع کا فریضہ ادا کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ سرکاری ملازمت کی مجبوریوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں حقائق کے چہرے سے نقاب الٹ دیا اور 1857ء کے ہنگاموں کا ذمہ دار برطانوی حکومتی پالیسیوں کو گردانا۔ اس کتاب کی ابتداء میں ہی انہوں نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

''1857ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی اور فوج کی بغاوت نے یہ آگ لگا دی''۔ (اسباب بغاوت ہند)۔

انگریز کو معلوم تھا کہ 1857ء کے ہنگاموں کے دوران سرسید نے اپنی جان پر کھیل کر بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائی ہیں۔ سرسید نے محض انسانی ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت ایسا کیا تھا، لیکن جب سرسید نے مذکورہ ہنگاموں کی ذمہ داری برطانوی حکومت کی غلط پالیسیوں کو قرار دیا تو گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکریٹری مسٹر سیسل بیڈن نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا:

''اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسب ضابطہ فوراً باز پرس کی جائے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے۔''

مسلمانوں کا حال یہ ہو چکا تھا کہ ہر نئی چیز کو وہ شک کی نظر سے دیکھتے اور ہر نئی سائنسی ایجاد ان کے ماتھے کو شکن آلود کر دیتی تھی۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اس ذہنی پسماندگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب برصغیر میں پانی کے پائپوں (Pipes) اور ٹائپ رائٹر (Type Writer) کا استعمال شروع ہوا تو اکبرالہ آبادی نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ظریفانہ انداز میں لکھا کہ۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

خدائے تعالیٰ نے سرسید احمد خان کے دل میں قومی ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ وافر مقدار میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ ان کی دور رس نگاہوں نے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کی معاشی فلاکت، فکری تشتت اور سیاسی بدنظمی

محض اس وجہ سے ہے کہ وہ تعلیمی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ برصغیر کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی توجہ تاج محل اور قطب مینار جیسی عمارات بنانے پر مرکوز کئے رکھی جبکہ برطانیہ میں Cambridge اور Oxford کے نام سے بین الاقوامی شہرت کی حامل جامعات (Universities) تعمیر کر لی گئی تھیں۔ قانون مکافاتِ عمل کی رو سے نتیجہ بالکل واضح تھا۔ یونیورسٹیاں بنانے والی قوم حکمرانی کر رہی تھی جبکہ تاج محل جیسی افسانوی شہرت کی حامل عمارتیں بنانے والی قوم خود افسانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ سرسید نے سب سے پہلے 1863ء میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے ایک علمی بزم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد فلسفہ اور سائنس کے جدید ترین لٹریچر کو اردو زبان میں منتقل کرنا تھا۔ اس بزم نے اپنا کام شروع کر دیا تو مخالفت کا ایک طوفان امڈ آیا جس کا اندازہ سرسید کے ایک مشہور مضمون ''ہماری ورنیکلر زبان'' کے ایک اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''ہمارے لئے یہ کھلا ہوا سیدھا راستہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے' یورپین لٹریچر اور سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں..... بے شک ہم کو اپنی قوم کی جہالت اور تعصب کا مقابلہ کرنا ہے اور ادھر فتح مند قوم کے ان تنگ دل لوگوں کی مزاحمت برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل اور پولیٹیکل ترقی کو اپنی طبعی تنگ دلی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف' انگلش تمدن' یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہے۔ مگر ہم کو اپنی اور صرف اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہئے اور جو تکالیف اور مشکلات پیش آئیں' نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔ مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ رفارمر (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور کر کے رہے گا اور کوئی مزاحمت' کوئی ناخوشی و خفگی اس کو روک نہیں سکے گی۔''

سوسائٹی کی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے غازی پور میں ایک جدید علوم کے مدرسے کی بنیاد رکھی۔ 1866ء میں آپ نے ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کا اداریہ سرسید خود لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی' سماجی' علمی اور اخلاقی مضامین بھی اکثر و بیشتر سرسید کے رشحات قلم کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ اس اخبار نے شمالی ہند میں بیداری اور شعور کی لہر دوڑا دی یہ اخبار 32 سال تک عوام الناس میں سائنسی علوم کے حصول کا شعور اجاگر کرتا رہا۔

1870ء میں سرسید نے انگلستان کے سفر (جس کی تفصیل آگے آتی ہے)' سے واپسی پر ایک رسالہ

''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے نے تین چار سالوں میں وہ زمین تیار کر لی جس پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ جسے بعد ازاں کالج اور پھر یونیورسٹی بننا تھا' کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کام میں اپنوں کی شدید مخالفت' غیروں کے بے حسی' شاعروں کی ہجویں اور پھبتیاں' کم سوادوں کی گالیاں' ملا کے فتاویٰ..... الغرض بہت کچھ تھا جو حصولِ منزل کے راستے میں مثلِ سنگ ہائے گراں تھا۔ جن دنوں سرسید علی گڑھ کالج کے لئے چندہ اکٹھا کرنے قریہ قریہ' بستی بستی اور شہر شہر پھرا کرتے تھے' اکبر الہ آبادی جیسے شاعر نے ان پر فرعون کی پھبتی کسی۔ ان کا یہ شعر آج بھی زبان زد خاص و عام ہے مگر کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس شعر کا مصداق کس عظیم ہستی کو بنایا گیا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کبھی حکمرانوں کے ساتھ سرسید کے تعلقات کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ اگر کسی انگریز کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا تو ''یار لوگوں'' نے کہا

کرتے ہیں جا کے ڈِنر روز وہ حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
(اکبر)

سرسید نے کبھی ان پھبتیوں' طعنوں اور گالیوں کی پروا نہیں کی۔ وہ اگر راستے کی ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتے تو کبھی گوہرِ مراد نہ پا سکتے۔ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا سودا سرسید کے سر میں اس قدر سمایا ہوا تھا کہ اس کے لئے انہوں نے کبھی اپنی عزتِ نفس کا خیال بھی نہیں کیا۔ چندے کے لئے ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ ایک آرٹیکل میں وہ خود لکھتے ہیں:

''ہمارا حال تو اب یہ ہو گیا ہے کہ دوست بھی ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا ہے سو اس لکھے کی بد ملاتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے''۔

ایک مرتبہ سرسید ایک انگریز مسافر سے جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا چندہ مانگنے چلے گئے۔ اس کے ساتھ جان نہ پہچان' اس انگریز نے اس بات کا برا مانا اور نہایت رکھائی سے جواب دیا:

''آپ کو اس کام کے لئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہئے' دوسروں سے نہیں''۔

بجائے نادم ہونے یا خجالت محسوس کرنے کے' سرسید نے جواب دیا:

''بے شک اپنی قوم کی پست ہمتی کے باعث ہم غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنے کے لئے مجبور ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ اگر انگریزوں کی مدد کے بغیر

یہ انسٹی ٹیوٹ کامیاب ہوگیا تو انگریزوں کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت کی بات نہ ہوگی کہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھانے کے باوجود وہ ہندوستان کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہ ہوئے''۔

یہ سن کر وہی انگریز مسافر اب شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ خود بخود اس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور بیس روپے نکال کر سرسید کو پیش کر دیئے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سرسید اپنے خوابوں کی تعبیر یعنی علی گڑھ کالج کی کامیابی اور اپنی محنتوں کو ثمر بار دیکھ کر عالم سرشاری میں اپنا یہ شعر گنگنایا کرتے ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک مے آرد بہ درمانے کہ من دارم

[جو یونان میرے پاس ہے (یعنی علی گڑھ کالج) اس میں ایسے عالم پیدا ہو رہے ہیں کہ اگر افلاطون بھی یہاں آنکلے تو ان کے آگے اپنے آپ کو بچہ سمجھے۔ میرے پاس اپنی قوم کے امراض کا ایسا علاج ہے (یعنی علی گڑھ کالج) کہ اگر جناب مسیح بھی اسے دیکھ لیں تو رشک کرنے لگ جائیں]

سرسید نے اپنی تعلیمی مہم اور جدوجہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انگلستان جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ان کے پیش نظر سفر انگلستان کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو وہاں کے نظام تعلیم و تدریس کا بچشم سر مشاہدہ کرنا۔ ضمناً' سرسید وہاں کے دو رسالہ جات (Spectator) اور (Tatler) سے متاثر ہوئے۔ یہ اصلاحی رسالہ جات انگریزی معاشرے کی خامیوں پر گاہے ہلکی پھلکی اور گاہے کاٹ دار طنز کے ذریعے تنقید کیا کرتے تھے۔ سرسید نے انہی خطوط پر ہندوستان میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انگلستان جانے کا دوسرا مقصد خالصتاً دینی تھا۔ اتر پردیش کے لیفٹیننٹ گورنر' سر ولیم میور ایک فاضل اہل علم تھے۔ انہوں نے ''لائف آف محمدؐ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں چند روایات کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو ہدف اعتراض بنایا تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کامل خاموشی کے بعد سرسید نے خود مذکورہ بالا کتاب کا جواب لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس مقصد کے لئے جن معاون کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں دستیاب نہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے انگلستان جا کر' وہاں کی لائبریریوں میں بیٹھ کر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ معاشی دشواریاں سدراہ تھیں۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے اپنے کتب خانے کو بیچا' کوٹھی کو رہن رکھا اور انگلستان کی راہ لی۔ نواب محسن الملک اپنے ایک خط میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خان کو لکھتے ہیں'

''لوگ ولایت جا کر تھیٹر' پارک' میوزیم اور عمارتوں کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامیٔ دین اسلام (یعنی سرسید) کتب خانہ میں بیٹھا ہوا ''خطبات احمدیہ'' کی تصنیف میں منہمک تھا' اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا انگلستان جانا قوم کے لئے تھا' رہنا قوم کے لئے

اور پھر واپس آنا قوم کے واسطے''۔ (حیاتِ جاوید از حالی)۔

کتاب شائع ہوئی اور اپنوں اور بیگانوں نے پڑھی۔ اپنوں نے بنظرِ استحسان دیکھا' غیروں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''سر ولیم میور (نے) جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے' جس وقت ''خطبات احمدیہ'' کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ 'میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آتے ہیں'۔ یہ بعینہٖ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیرانداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اس پر تیر برسانے شروع کر دے اور جب ادھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے' تیراندازوں سے نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے..... ایک نئے طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے' اس لئے ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات انہوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کئے تھے' اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ ان کی زبان سے نکلے' جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا''۔

('حیات جاوید' از حالی۔۔۔ بحوالہ خطبات سیرت النبیؐ از سرسید' شائع کردہ دوست ایسوسی ایٹس' لاہور)

اب ہم سرسید کی جدوجہد کے اس پہلو کی طرف آتے ہیں جس کی سب سے زیادہ اور شدید مخالفت ہوئی۔ انگریز کی حکومت میں مغرب سے پادریوں کے غول در غول ہندوستان کا رخ کئے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ مناظرے ہو رہے تھے۔ کہیں آریہ سماجیوں اور مسلمانوں کے مناظرے' کہیں عیسائی پادریوں کے مسلمانوں سے مناظرے۔ مخالفین روایات کی کتابوں سے نکال نکال کر ایسی وضعی روایات پیش کرتے تھے جن کا ہماری مذہبی پیشوائیت سے جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ اس زعیم ملت نے صدیوں کے جمود اور تعطل کو جو شش کر دار سے توڑ ڈالا۔ مسلمانوں میں فکری' نظری اور نفسیاتی انقلاب برپا کر دیا اور انہیں عقلی دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح کر دیا۔ وہی مسلمان جو پادریوں اور آریہ علماء کے اعتراضات کے سامنے جھینپا جھینپا سا نظر آتا تھا' اب دوبدو ان سے نظریں ملا کر بات کرنے لگا۔ کہنے کو تو سرسید کی شخصیت محض ایک فرد کی سی تھی مگر اثر پذیری کے لحاظ سے ایک زمانہ انہوں نے دیوانہ کر رکھا تھا۔ جو بھی ایک دفعہ ان کی تقریر یا بات سن لیتا' انہی کا ہو جاتا۔ الطاف حسین حالی' محسن الملک' وقار الملک' ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی چراغ

علی وغیرہ سب سرسید کی ادائے دلبری کے کشتگان تھے۔ حتیٰ کہ اکبر الہ آبادی جیسے شاعر بھی آخری عمر میں آپ کی عظمت کے معتقد ہو گئے اور اپنے سابقہ مؤقف سے رجوع کرلیا۔

وہ کون سے نظریات تھے جن کی بنا پر سرسید کو بارگاہ پیشوائیت سے کافر' ملحد' بے دین' کرسٹان' دہریہ اور نیچری کے خطابات عطا ہوئے تھے' یہ سوال بڑا اہم اور غور طلب ہے۔ سرسید احمد خان کا عقیدہ تھا کہ معیار صداقت صرف قرآن ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' میں حالی سرسید کے اس مسلک کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اسلام کے متعارف مجموعے میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبیؐ آخر زماں کے دل میں القاء ہوا ہے اسی طرح نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ جس میں جو بات مسائل فلسفہ وحکمت کے خلاف معلوم ہو' اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے' یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے' ''حسبنا کتاب اللہ'' کہہ کر اپنے جدید علم کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا''۔

مذہبی پیشوائیت ایک طرف دعویٰ کرتی تھی کہ ''اسلام دنیا سے غلامی کو مٹانے آیا ہے''۔ مگر دوسری طرف اس کے جواز میں دلائل بھی دیتی تھی (اور آج تک دیتی ہے)۔ سرسید نے ''رسالہ ابطالِ غلامی'' لکھ کر قرآن سے ثابت کیا کہ اسلام نے آئندہ کے لئے غلامی کو آیت (47/4) کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ اس تحریر کے ٹھیک انیس برس بعد (1888ء میں) ایک روشن ضمیر عالم احمد شفیق بک نے انہی خطوط پر غلامی کے ابطال پر وہ رسالہ لکھا جس نے ترکی اور مصر کے علاوہ یورپی ممالک میں مصنف کی شہرت وفضیلت کی دھاک بٹھا دی۔

سرسید کو آنحضرتﷺ کی ذاتِ اقدس واعظم سے غایت درجہ محبت وشیفتگی تھی۔ جس روایت کا مضمون آنحضرتﷺ کی شان کے منافی ہوتا سرسید کے ہاں وہ روایت بار نہیں پاسکتی تھی۔ یہ رسول اللہﷺ سے محبت ہی تھی جو سرسید کو دیار غیر کی خاک چھاننے اور وہاں بیٹھ کر ناموسِ نبی پر کئے جانے والے اعتراضات کے دفاع میں ''خطباتِ احمدیہ'' تحریر کرنے پر مجبور کر گئی۔ رسالت مآبﷺ سے وابستگی ان کے اس مشہور شعر سے بخوبی سمجھی جاسکتی ہے جسے انہوں نے اپنی تفسیر القرآن میں درج کیا ہے۔ ؎

خدا دارم دل بریاں زعشق مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
[میں ایک خدا رکھتا ہوں اور آتشِ عشقِ مصطفیٰ میں بھنا ہوا دل رکھتا ہوں۔
ایسا ساز و سامان تو کسی کافر کے پاس بھی نہیں ہے جیسا مال و متاع میرے پاس ہے]

ہمارے ہاں صدیوں کی تقلید کی وجہ سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ قرآن کی بعض آیات نے بعض دوسری آیات کو منسوخ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس عقیدے کی رو سے منسوخ آیات کی تلاوت تو جاری رہے گی مگر ان کے احکام پر عمل نہیں ہوگا۔ ایک زمانہ تک منسوخ آیتوں کی تعداد پانچ سو تک پہنچ گئی تھی۔ امام سیوطی نے ان کو بیس تک محدود کر دیا۔ شاہ ولی اللہ نے مزید گھٹا کر ان کی تعداد پانچ کر دی۔ سرسید کا کہنا تھا کہ جس کتاب نے قیامت تک انسانیت کو ہدایت دینی ہو اس کی ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی جس آیت سے ناسخ و منسوخ کا عقیدہ وضع کیا گیا ہے وہاں نسخ سے مراد سابقہ شریعتوں کا منسوخ ہونا ہے نہ کہ قرآن کی کسی آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ اسی طرح سرسید نے معجزات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کوئی سرسید کے استنباط سے متفق ہی ہو۔ یہ ایک انسان کی انفرادی فکر ہے جس میں صحت اور غلطی دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے۔ واقعۂ معراج کو سرسید حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر اصحاب کے تتبع میں بحالتِ خواب تسلیم کرتے تھے۔

سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا تو مخالفت کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ انہوں نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ سرسید کی تفسیر کے مقابلے میں ''تفسیر حقانی'' جیسی متعدد تفاسیر لکھ ڈالی گئیں۔ 'تہذیب الاخلاق' کے مقابل ''امداد الاحتساب''۔ ''امداد الآفاق''۔ ''نورالآفاق''۔ ''لوح محفوظ''۔ ''شہابِ ثاقب''۔ ''تائیدِ اسلام' اور ''اشاعت السنۃ'' جیسے اخبار جاری کئے گئے۔ ان تمام اخباروں' رسالوں اور تفسیروں میں سرسید کے عقائد کو غلط رنگ دے کر اور اپنی طرف سے مرچ مصالحہ لگا کر مبالغہ آمیز حد تک لے جایا جاتا تھا۔ پھر سارا زورِ قلم ان کو کافر' دجال' ملحد' کرسٹان' لامذہب' دہریہ اور نیچری جیسے خطابات دینے پر صرف کیا جاتا۔ نمونے کے طور پر صرف ایک فتویٰ ملاحظہ کریں جو برصغیر کے ''مفتیانِ شرعِ متین'' نے مدینہ جا کر وہاں کے مفتیانِ کرام سے حاصل کیا تھا:

''یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہوگیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہوگئیں تو قتل نہ کیا جائے۔ ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔.....
یہ مدرسہ جس کو خدا برباد کرے اور اس کے بانی کو ہلاک کرے' اس کی اعانت جائز نہیں۔ اگر مدرسہ

تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی کو اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے''۔

ان فتاویٰ پر برافروختہ ہونے کی بجائے سرسید ایک خندہ زیر لبی سے کہا کرتے تھے:

''ہمیں ملحد و زندیق اور لامذہب کہنا ہمارے لئے قطعاً باعثِ تعجب نہیں کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد و ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبرِ آخرالزماں محمد الرسول اللہ ﷺ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا، فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسا ہمارے جدِ امجد ابراہیم اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد و ذوالجلال اور پیغمبر محمد الرسول اللہ ﷺ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہمیں ملحد و زندیق اور لامذہب نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ کیوں کہ ہم ان کے خداؤں، پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔'' (حیاتِ جاوید)۔

سرسید کی شخصیت اپنے اندر ہمہ جہت پہلو رکھتی ہے اور یہ مقالہ جو پہلے ہی خاصا طویل ہو گیا ہے، اس بات کا متقاضی ہے کہ بات کو آئندہ کسی وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ مسلمان قوم کا یہ عدیم المثال رہنما 27 مارچ 1898ء کو اس حال میں دنیائے فانی سے کوچ کر گیا کہ مخالفین کو بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ سرسید کی مخالفت کرنے والوں کو سوائے ان کے اپنے حلقۂ ہم مسلکاں کے آج کوئی بھی نہیں جانتا مگر سرسید کی شہرت جب بھی اور اب بھی عالمگیر ہے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد حسین رزاقی

اِصلاحِ عقائد کے لئے سرسیّد کی کوششیں

سرسید کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ صدیوں کے دوران میں وہ رفتہ رفتہ صحیح اسلامی تعلیمات اور اس کے اصول و مقاصد سے دور ہو گئے تھے اور غیر محسوس طریقہ پر اس ملک کی غیر مسلم قوموں کے ایسے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اختیار کر لئے تھے۔ جو درحقیقت اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کے اس غلط طرزِ عمل اور ملک کے بدلے ہوئے حالات نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے شدید خطرات اور اہم مسائل پیدا کر دیئے تھے اور اسلام کے فروغ و استحکام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ان کے عقائد و نظریات کو درست کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ سرسید نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی اصلاحی تحریک میں دینی عقائد کی درستی کو بنیادی اہمیت دی۔ سرسید کو اس بات کا رنج تھا کہ مسلمان غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی تصور کر کے ان پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی دینی و معاشری حالت بگڑ گئی ہے اور دوسری طرف اسلام کی بدنامی ہوتی ہے کیونکہ لوگ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اسلام کے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس غلط خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کی دینی و معاشری حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرسید نے مسلمانوں کے عقائد و نظریات درست کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور اس مقصد کے لئے موثر جدوجہد شروع کر دی۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان پر عیسائیوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور ان کے تبلیغی ادارے جن کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی، مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے اسلام پر طرح طرح کے الزام عائد کرتے تھے۔ لیکن مسلمان اپنے مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کی موثر تردید نہ کر سکتے تھے اور عیسائی پروپیگنڈے سے ان کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اسلام کے دشمنوں نے عیسائیوں کے ذہن میں

یہ بات بٹھادی تھی کہ اسلام' انسانی ترقی اور تہذیب وتمدن کا مخالف اور خون آشام مذہب ہے۔ اس لئے عیسائی مسلمانوں کو بہت خطرناک تصور کرتے تھے اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ ان کو اپنا شدید مخالف سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نے ان کے اس اندیشہ کو درست ثابت کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو موقع مل گیا تو وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس لئے انگریزوں کی پالیسی مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت پر مبنی تھی۔ اور انہوں نے جو طریقہ تعلیم نافذ کیا وہ مسلمانوں کے دینی عقائد میں شکوک وشبہات اور انتشار پیدا کرنے والا تھا چونکہ مسلمان اسلام سے صحیح طور پر واقف نہ تھے اور نئے نظام تعلیم میں ان کی مذہبی تعلیم وتربیت کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام سے بدگمانی پیدا ہو جانے کا قوی امکان تھا اور بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لئے جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ یہ وہ بڑے خطرات تھے جن پر غالب آنا ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے بہت ضروری تھا اور سرسید نے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے دینی عقائد کی اصلاح کے لئے اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کیا۔ عیسائیوں کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ انگریزی حکومت کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور جدید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم وتربیت دینے کے منصوبہ کو بڑی خوبی اور کامیابی سے عملی شکل دی۔

مذہب کی سچائی اور فضیلت کا معیار

عقائد ونظریات کو درست کرنے کے لئے سرسید نے یہ کوشش کی کہ اسلام کا صحیح تصور مسلمانوں کے ذہن میں بیٹھ جائے اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ محض عبادات اور رسوم ورواج کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے والا دین ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسان کی پوری زندگی کو سنوارنا اور نکھارنا ہے۔ اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے تمام اصول فطرت انسانی * کے مطابق ہیں اور اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو انسان کے مرتبہ کے منافی ہو یا جس پر عمل کرنا اس کے امکانات سے باہر ہو۔ اسلام کے بارے میں سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ''کوئی مذہب ایسا دنیا میں نہیں ہے جو دوسرے مذہب پر گو وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو اپنی ترجیح بہ ہمہ وجوہ ثابت کر دے مگر یہ رتبہ صرف اسی مذہب کو حاصل ہے جو نیچر * کے مطابق ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ صرف ایک مذہب ہے جس کو میں ٹھیٹھ اسلام کہتا ہوں اور جو بدعات محدثات سے اور غلط خیال اجماع سے اور خطائے اجتہادات سے اور

ڈھکوسلۂ قیاسات سے اور شکنجۂ اصول فقہ مخترعہ سے مبرا و پاک ہے۔'' مذہب کی سچائی اور برتری کا معیار سرسید نے یہ قرار دیا کہ اس میں کوئی بات قانون فطرت کے برخلاف نہ ہو کیونکہ قانون فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونا ضروری ہے۔ مذہب کو جانچنے کے اسی معیار کے مطابق انہوں نے اسلام کی سچائی اور فضیلت کو تسلیم کیا اور ۱۸۸۴ء میں لاہور میں اسلام پر تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام فطری دین ہے اور اس کے اصول فطرت کے مطابق ہیں منطق و فلسفہ اور علم طبعی میں کتنی کچھ تبدیلی کیوں نہ ہو اور ان کے مسائل اسلام کے مخالف ہی کیوں نہ معلوم ہوں اسلام ہی برحق اور سچا ہے۔ اسلام فطرت انسانی کے مطابق ہے اور یہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔ اسلام کے مسائل دو قسم کے ہیں منصوصی اور اجتہادی۔ خدا اور خدا کی وحدانیت پر ایمان اور تصدیق نبوت اسلام کے دو بنیادی رکن ہیں اور اسلامی احکام کا وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عنداللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخرالزماںؐ کے دل میں القا ہوا ہے اس طرح بے کم و کاست نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی پوری طرح تعمیل کرنا لازمی ہے اور یہ حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ وحکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے لیکن اجتہادی مسائل صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی اور ان میں جو غلط ہوں ان کی اصلاح کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے کیونکہ اجتہادی مسئلہ مجتہد کا خیال ہے جو خطا سے معصوم نہیں۔ چنانچہ اجتہادی مسائل اگر فطرت انسانی کے برخلاف ہوں تو اس سے اسلام پر حرف نہیں آتا اور اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں آتا۔

دین و دنیا میں تفریق کا غلط رجحان

اسلام نے دین اور دنیا میں تفریق کرنے کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کی ہے اور دونوں کی بہتری کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن اسلامی اثرات کے تحت مسلمانوں میں دین اور دنیا میں تفریق کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں کی اصلاح میں یہ خیال ایک بڑی رکاوٹ تھا کہ اصل چیز تو صرف اخروی ہے۔ دنیاوی نعمتیں حاصل کرنے کی خواہش بڑی گمراہی ہے۔ اس عقیدے نے مسلمانوں میں اس قدر غلط احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی تباہ حال زندگی کو سنوارنے اور ترقی کرنے کے خیال سے غافل ہوگئے تھے۔ اس رجحان کو ختم کر کے لوگوں کو اپنی حالت کو بہتر بنانے پر متوجہ کرنے کے لئے سرسید نے ان کو یہ بتلایا کہ نجات ابدی جو ہر سچے مذہب یا سچے دین کا نتیجہ ہے وہ دنیا کے ساتھ لازم وملزوم نہیں ہے۔ ایک ایسا

شخص جس نے تمام عمر عسرت و تنگی میں بسر کی ہو سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے اور جس نے لاکھوں' کروڑوں روپے جائز طور پر پیدا اور صرف کئے ہوں وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی پا سکتا ہے دنیا اور دین میں ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ فرض کرو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے سب مفلس اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوں اور در بدر بھیک مانگتے پھریں۔ اور ان کی اولاد جاہل اور نالائق' چور اور بدمعاش ہو تو اس وقت ان کے دین کا کیا حال ہو گا۔ پیٹ ایک ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے۔ خدا ملے یا نہ ملے اس کو بہرحال بھرنا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں۔ کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہیں یا کسی کا گھوڑا مل رہے ہیں لیکن جو ایسے پکے دیندار نہیں ہیں وہ کیا کریں گے معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور نوآباد جزائر بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسیا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی۔ اگر مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہو جائے کہ واعظین کو جو محض ریا کاری اور مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں۔ کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمۂ تر کھلانے والا نہ رہے' جناب حضرت پیر جی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کے اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدر اوشمس بازغہ پڑھاتے ہیں ان کو کوئی چار پیسے کا نوکر رکھنے والا نہ رہے اسوقت ان سب کو یہ پتہ چلے گا کہ مسلمانوں میں دنیاوی ترقی و تہذیب اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا اور امر معاش میں منہمک ہونا امر معاد سے غفلت برتنا ہے یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سرتاسر معاد کا ہے۔

سرسید کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی دنیاوی حالت اچھی ہوگی تو اس سے ان کے دین کی بھی عزت اور توقیر بڑھے گی اور اگر وہ دنیاوی اعتبار سے ذلیل و خوار ہوں گے تو ان کی اس حالت سے ان کے دین پر بھی برا اثر پڑے گا۔ چنانچہ ایسی حالت میں جب کہ مسلمان معاشی تباہی' معاشری بدحالی اور علم سے محرومی کے باعث روز بروز پست سے پست تر ہوتے جا رہے تھے اور ذلیل و حقیر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو' علوم دینی قائم رہیں۔ علوم دنیاوی قائم رہیں۔ علوم دنیاوی جو مفید و کارآمد ہیں انکا رواج اور ترقی ہو۔ لوگ معاش سے فارغ البال ہوں اکل حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں۔ حسن معاشرت میں جو نقص ہوں وہ رفع ہوں۔ جن بری رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں

مسلمانوں کو' اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں۔ وہ موقوف کی جاویں جو خلاف شرع تعصّبات وتوہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دور کئے جاویں۔ سرسید کے نزدیک محض دنیا پرستی نہ تھی بلکہ عین دینداری بھی تھی۔

عبادت کا مفہوم

عبادت کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط تصور قائم ہوگیا تھا سرسید نے اس کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ لوگ اس چیز کو بھول گئے تھے کہ ایک فطری دین اس چیز کو پسند نہیں کرسکتا کہ عبادت قانون فطرت کے خلاف ہو۔ اور انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرے جو فطرت نے اس پر عائد کئے ہیں۔ عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف لوگوں کا خیال یہ تھا کہ تمام رات نماز پڑھنا ہمیشہ دن کو روزہ رکھنا یا کبھی شادی نہ کرنا قابل تعریف عبادت ہے۔ لیکن عبادت کا یہ ایسا تصور ہے جس کو خود حضور رسالت مآبؐ نے غلط قرار دیا ہے۔ سرسید نے حضورؐ کے اس خیال کو سند قرار دے کر مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ ''اصلی اور سچی عبادت وہی ہے جو قانون قدرت کے اصول کے مطابق ہو اور تمام نیکیاں اور عبادتیں جو قانون قدرت کے برخلاف ہوتی ہیں پوری نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہوتیں۔ تمام قویٰ جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کئے ہیں وہ اس لئے پیدا نہیں کئے کہ وہ بیکار کر دیئے جائیں بلکہ اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ سب کام میں لائے جائیں۔ اسلام نے ان قوائے کے کام میں لانے کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس سے جملہ قوائے اعتدال پر اور شگفتہ و شاداب رہیں اور ایک کے غلبہ سے دوسرا بیکار اور پژمردہ نہ ہو جائے مگر بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں اور اس طریقہ کو جس کو ہمارے پیغمبر خدا صلعم نے رہبانیت قرار دیا ہے اور جس کو ہندی زبان میں جوگ کہتے ہیں' کمال عبادت اور انتہائے زہد وتقویٰ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے مسلمانوں نے سوائے فرائض کے باقی عبادتوں کو صرف نماز' روزہ وتلاوت قرآن مجید اور خیالی ترک دنیا اور درس و تدریس علوم دینیہ اور اوماثورہ یا وظائفِ مقررۂ پیران ہی میں منحصر کر رکھا ہے حالانکہ انہیں پر ان کا انحصار محض غلط ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض ایسے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جو قانون قدرت کے برخلاف ہیں اور اس لئے مقصود شارعؑ نہیں ہیں''۔

زہد و ریاضت

مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے کے لئے سرسید نے اس خیال کو غلط قرار دیا جو زہد و ریاضت کے بارے میں عام طور پر پایا جاتا تھا اور اس بات پر بہت زور دیا کہ جو نیک کام ذکر و اشغال سے زیادہ مفید ہیں وہ بھی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو مناسب اہمیت نہ دینا بڑی غلطی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایک بڑی غلطی جس میں مسلمان پڑے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل کرنے اور

نفل پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے پر منحصر سمجھا ہے۔ زہد و ریاضت جہاں تک کہ حد شرعی سے تجاوز نہ کرے بلا شبہ نیکی و عبادت ہے۔ مگر عام فلاح پر کوشش کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کے دینی اور دنیوی حال اور مال کی بھلائی و بہتری کے ہوں اس سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے اور اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھڑی میں بیٹھ کر کھانا کھاوے اور صرف اپنا پیٹ بھر لے۔ لیکن عام فلاح چاہنے والا جو اس کام میں زہد و ریاضت کرتا ہے اس کی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھلا کر کھاتا ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی ہے کہ تن پروری کو تو عبادت سمجھا جائے اور اصلی فیاضی اور سخاوت اور ہمدردی کو عبادت نہ سمجھا جائے۔

سرسید کے نزدیک حالات کے بدلنے سے عبادت اور ثواب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ کسی مقام میں اگر پانی کا قحط ہو تو اس جگہ بیٹھ کر نفل پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے یا ذکر و شغل کی ضرب لگانے سے زیادہ ثواب کا کام یہ ہے کہ کندھے پر مشک لاد کر لوگوں کو پانی پلایا جائے۔ اسلئے ایک ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہوگئی ہو ان کی فلاح و ترقی اور بہتری کے لئے کوشش کرنا نفلیں پڑھنے اور رات کو جاگ کر ریاضت کرنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔

ترکِ دنیا

مسلمانوں کے جو غلط رجحانات ان کے زوال کا باعث بنے اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے جن کو ختم کرنا سرسید نے ضروری سمجھا۔ ان میں ترک دنیا کو عبادت تصور کرنے کا غیر اسلامی عقیدہ بھی شامل تھا۔ اسلام اس کی اجازت تو ہرگز نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کا بندہ اور دنیاوی لذتوں اور خواہشوں کا غلام بنجائے لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دنیاوی نعمتیں پیدا کی ہیں انسان ان سے مناسب طور پر فائدہ اٹھائے اور ان کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے استعمال کرے۔ لیکن مسلمان جب اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہونے لگے تو انہوں نے راہبوں اور جوگیوں کا اثر قبول کر لیا اور ترک دنیا کو عبادت خیال کرنے لگے۔ ان کی یہ مفروضہ دینداری درحقیقت دین اور اس کے معاشری مقاصد کے خلاف تھی اور سرسید نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ خیال کہ ترک دنیا عبادت ہے ایک ایسا غلط اور جھوٹا قول ہے کہ اس سے زیادہ دوسرا نہیں ہوسکتا۔ دنیا ہمارے لئے پیدا ہوئی ہے اور ہم دنیا کے لئے۔ پھر ہم اس کو اس طرح پر جس طرح کہ جھوٹے دنیا ترک کرنے والے ترک کرنے کو کہتے ہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔ ہاں جس طرح کہ شارعؑ نے ترک دنیا کرنا بتایا ہے اس طرح پر ترک کرنا سچا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس طرح پر پکڑیں جس طرح کہ شارعؑ نے بتایا

ہے نہ کہ اپنے جذبات نفسانی کی مرضی پر اور اس کو اس طرح پر کام میں لائیں جس طرح قانون قدرت نے ہم کو سکھایا ہے نہ کہ اپنی ہوائے نفسی کے مطابق۔ پس یہ بات سمجھنا کہ امورات دنیا میں مصروف ہونا عبادت نہیں ہے عین غلطی ہے۔ اس کو قانون قدرت کے برخلاف استعمال میں لانا شقاوت اور اس کے مطابق برتاؤ میں لانا عین عبادت ہے۔

سرسید نے اس خدا پرست کو نادان قرار دیا ہے جو صرف خدا کی محبت اور دنیا سے نفرت کا طلبگار رہو۔ جس کو زہد وتقویٰ کے سوا اور کچھ کام نہ ہو اور دنیا کی طرف سے نہایت عاجز وذلیل اور بے استطاعت و بے مقدور ہو اور جو نہ خود عزت سے رہ سکے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے اور اس کے برعکس ایسے دنیا دار کو بہت دانا سمجھتے ہیں جو نیک کاموں کے لئے دنیا اور اس کی نعمتوں کا طلب گار ہو اور دنیا کی جاہ وحشمت سے مالا مال ہو کر قوم کی بھلائی اور ترقی کے اسباب مہیا کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ''طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی طرح غوٹرغوں غوٹرغوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے بلکہ اس نے جو چیزیں مرحمت کی ہیں ان کو اسی کے کام میں صرف کرنا خدا کی یاد ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو تمام نعمتیں اس لئے عطا کی ہیں کہ ہم خود بھی ان سے فائدہ اٹھائیں اور اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

جس زمانہ میں سرسید علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دہلی کے نامور عالم اور مفسر قرآن مولانا عبدالحقؒ دہلوی نے مدرسہ کے مقاصد پر کچھ اعتراضات کر کے دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو ناپائیدار قرار دے کر یہ نصیحت کی کہ انسان ہر دم کو دم واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ سرسید نے مدرسہ کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور مولانا کی نصیحت کا یہ جواب دیا کہ بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلیٰ وادنیٰ' عالم وجاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو آخر میں یہ ارقام نہ فرماتے ''سخن منتظر الجواب'' کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی نصیحت کا کہ ہر دکو دم واپسیں جانا چاہئے کیوں خیال نہ رہا؟ میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے؟ کبھی اپنے رہنے کے لئے چھپر ڈلوایا ہے؟ آپ کے پاس پہننے کے جوڑے ہیں؟ ان میں سے ایک تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے اور باقیوں کو آئندہ پہننے کے لئے رکھا ہوگا۔ کم سے کم نانبائی کو صبح وشام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے' اور اس ماہ مبارک رمضان میں سحری کے لئے بھی کچھ ضروری اٹھا رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں

نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں مگر ابیض نورانی* کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں؟ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے جس سے خدا اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے۔ اور جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لئے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعت محمدیہؐ کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو۔ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں اور اس نے ہمارے لئے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لئے وقف کر دی ہیں بھول نہ جائیں۔'' سرسید کے اس جواب سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا اور اس کی نعمتوں کو ناپائیدار قرار دے کر ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان میں اتنی ہمت' طاقت اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنی تباہ حال قوم کو زوال وادبار کی پستیوں سے نکال کر راہ ترقی پر گامزن کر سکیں اس لئے وہ دینداری کا سہارا لے کر ایسی باتیں کہتے ہیں جو دین کے خلاف ہوتی ہیں اور جس کا نتیجہ قوم کے حق میں مزید تباہیوں کی شکل میں نکلتا ہے۔

پاک اور ناپاک علوم

غلط اور گمراہ کن نظریات نے مسلمانوں میں جو نقصان رساں عقائد پیدا کر دیئے اور جن کو دور کئے بغیر معاشرہ کی حالت کو بہتر بنانا ممکن نہیں ہے۔ ان میں یہ غلط خیال بھی شامل ہے کہ صرف دینی علوم کی تحصیل تو عبادت میں داخل ہے لیکن دنیاوی علوم کو حاصل کرنا بے دینی اور گمراہی کا ثبوت ہے۔ علم دین فقہ' تفسیر اور حدیث تک محدود ہے اور جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کرتا ہے وہ خبیث بن جاتا ہے علم کے متعلق یہ نظریہ سرسید نے غلط قرار دے کر یہ واضح کیا کہ اسی سبب سے مسلمانوں میں روز بروز علم کا تنزل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے خود علم دین بھی معدوم ہوتا جاتا ہے۔ علوم دینیہ کا صرف جاننا نہ کچھ عبادت ہے اور نہ کچھ ثواب۔ البتہ وہ اس وقت عبادت یا ثواب ہو سکتا ہے جب کہ اس کو امور دینی کے کام میں لانے کی نیت سے پڑھا جائے۔ پس مدار عبادت وثواب نیت پر رہا نہ کہ نفس علم پر۔ اور یہی حال تمام باقی علوم کا ہے۔ وہ تمام علوم جن کو دنیوی کہتے ہیں ترقی واستحکام اور تعلی علوم دینی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ گو ان کا پڑھنا بھی فی نفسہٖ عبادت نہیں ہے مگر جب کہ علوم دنیوی اس نیت سے پڑھے جائیں یا پڑھائے جائیں کہ یہ علوم دینیہ کے لئے مثل آلہ کے ہیں تو

ان کا پڑھنا یا پڑھانا بھی ویسا ہی عبادت ہے جیسا کہ علوم دینیہ کا ہے۔

علاوہ اس کے علوم دینوی بھی اگر ان کی تعلیم نیک طرح پر ہو تو باعث ترقی ایمان ہوتے ہیں۔ ہم ریاضی پڑھ کر خدا تعالیٰ کی اس قدرت کاملہ سے واقف ہیں جو خلق آسمان وزمین وکواکب وسیاروثوابت میں کام آتی ہے جس وقت ہم علم ارض پڑھتے ہیں تو ان عجائبات سے واقف ہوتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیوں کی رنگ آمیزی اور مکھی کی آنکھ کی پچی کاری ہم کو حکیم مطلق کی حکمت کاملہ پر یقین دلاتی ہے۔ اسی طرح تمام علوم ہماری معرفت کو قوت بخشتے اور خدائے واحد پر ہمارے ایمان کو اور مستحکم کرتے ہیں اور اس اعتبار سے اگر ہم ان علوم کو بھی علوم دینیہ میں شامل سمجھیں تو کچھ بعید نہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو ایسا عمدہ مذہب دیا ہے جو ہمارے معاد اور معاش دونوں کو قانون قدرت کے مطابق اصلاح کرنے اور ترقی دینے والا ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دنیوی کی تحصیل کریں تو دین کا کیا حال ہوگا۔ اسی طرح یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دینی پڑھا کریں تو ہماری دنیا کا' جس کی اصلاح شریعت سے خارج نہیں ہے' کیا حال ہوگا۔ علوم دنیاوی کے معدوم ہونے سے دین اور علوم دینی دونوں کے معدوم ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی وکوشش کریں۔ اور ایک کو دوسریکا آلہ سمجھ کر دونوں کو پڑھنا اور پڑھانا داخل عبادت جانیں۔''

ثواب اور اس کا مقصد

مسلمانوں کا ایک اور عقیدہ جس کو سرسید معاشرہ کی اصلاح وترقی کے لئے بدلنا چاہتے تھے۔ ثواب کا غلط تصور تھا۔ چند ایسے کام تھے جن کو کرنا مسلمانوں کے خیال میں کار ثواب تھا اور مسلمان یہ سمجھ کر ثواب کے یہ کام انجام دیتے تھے کہ اس کے بدلے میں ان کو جنت ملے گی۔ سرسید کے نزدیک ثواب کا یہ تصور بہت محدود' غلط اور خودغرضی پر مبنی تھا۔ اور انہوں نے اس خیال کو بدلنے کی کوشش کی۔ عام طور سے ثواب کے جو غلط معنی لئے جاتے تھے ان کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ جب ہم پچھلے زمانے پر نظر کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ ہر طرف ہزاروں کھنڈرات' مسجدوں' پلوں' کنوؤں اور مہمان سراؤں کے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے مہمان سرائیں بنوائیں۔ کنوئیں کھدوائے اور پل بنوائے۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے مفرق تھے۔ سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجد کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بڑی بڑی عالیشان خانقاہیں بھی تعمیر کیں جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں لیکن مدرسوں کے کچھ زیادہ نشانات نہیں ملتے۔ تاہم کئی مدرسے بھی قائم کئے

گئے۔جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اور کئی مدارس اب بھی جاری ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے۔لیکن جب زیادہ غور کرتے ہیں تو سب دھوکہ ہی دھوکہ نظر آتا ہے۔جنہوں نے یہ کام کئے اور کر رہے ہیں۔انکے دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کام اس خیالی جوش میں کئے ہیں کہ ہم ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھڑیاں باندھ رہے ہیں۔مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جائیں گے اور بہشت میں ہم بڑے بڑے درجے پائیں گے۔ ہمارے سر پر تاج ہوگا اور ایک موتی کا محل جنت میں ملے گا۔حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی۔ بے انتہا! جتنی چاہو! غلمان بھی نہایت خوبصورت ہوں گے۔ باغ ہوگا۔ میوہ ہوگا۔نہریں ہوں گی۔شراب ہوگی۔پئیں گے اور چین کریں گے۔'' بہشت میں یہ عیش وعشرت حاصل کرنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں سرسید نے ان کو قومی ہمدردی کے بجائے خودغرضی اور بالکل ایسے ہی کام قرار دیا ہے جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں انہی عیشوں کو حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔اگر باغبانوں کو مزدوری دے کر اپنے چین کے باغ لگوانا۔مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے لئے محل بنوانا اور کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لئے شراب کھنچوانا قومی ہمدردی اور کارثواب نہیں ہے تو پھر وہ کام جو جنت میں عیش کرنے کی غرض سے کئے جاتے ہیں قومی ہمدردی اور ثواب کے کام کیسے ہوسکتے ہیں۔

ثواب کے کاموں کو مسجدوں' خانقاہوں اور تالابوں کی تعمیر تک محدود رکھنے اور جنت میں عیش کرنے کی غرض سے یہ کام کرنے کے رجحان کو بدل کر قومی فلاح و ترقی کے لئے تمام ضروری کام انجام دینے پر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے سرسید نے یہ بتلایا کہ اسلام کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی مگر فتح مکہ کے بعد اسکا اجر کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تجہیز کے لئے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیقؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کرسکتا۔یہی سچا اصول مذہب اسلام کا ہے۔

ثواب کے کام

مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو خدمت خلق کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھتے تھے اور نیک کام کرنے کی امکانی کوشش اپنے نقطہ نظر کے مطابق کرتے تھے لیکن ان لوگوں کا نیکی اور خیر کا تصور چونکہ بہت محدود تھا اس لئے وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری امور اور خدمت خلق کے زیادہ اہم اور ضروری پہلوؤں پر توجہ نہ کرتے تھے۔ان کے خیال میں ثواب کے کام بس اسی حد تک محدود تھے کہ

مسجدیں بنوا دیں' لوگوں کے آرام کے لئے کنویں کھدوا دیں اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال نے مسلمانوں کو جن مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے بگڑے ہوئے حالات نے معاشری اصلاح' اقتصادی بہتری اور قومی ترقی کے لئے جن مسائل کو حل کرنا ناگزیر بنا دیا تھا ان پر قابو پانے کی تدبیریں ان کی نظر میں نہ تو نیکی اور ثواب تھیں اور نہ خدمت خلق۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس حقیقت کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کی معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس زمانے میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا ثواب کا کام قوم کی خدمت کرنا اور اس کو تباہی و بربادی سے بچانے میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے دل میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوتی ہے۔ انسانوں میں نیک وہ ہے جو بہت سی نیکیاں کرے مگر سب سے زیادہ نیک وہ ہوگا جس کی نیکیاں سب سے زیادہ افضل اور اعلیٰ ہوں۔ بعض لوگوں نے پل۔ مسجدیں۔ اور کنویں بنوائے اور ان چندروزہ رہنے والی نیکیوں کو خیر دائم سمجھ لیا۔ بعض لوگوں نے خیر خیرات میں زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا لیکن ان کی یہ نیکیاں خیر دائم نہیں بلکہ چندروزہ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ تو نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہو جاتی ہے بلکہ نسل درنسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے اور قیام دنیا تک دائم رہتی ہے۔ اس لئے صرف یہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء کو عطا کی۔ پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے اور تمام نیکیوں میں سے افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا ہے پس فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور تسبیح و تہلیل کو عبادت جاننا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خیر دائم اور بھی زیادہ نیک اس وقت ہو جاتی ہے جب اسکی ضرورت ہو اور موجودہ زمانے میں اور بالتخصیص مسلمانوں کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صرف تسبیح و تہلیل اور زہد و تقویٰ ہی پر تکیہ نہ کریں اور صرف ادائے زکوٰۃ اور قضائے دلدین ہی پر اقتصاء نہ کریں بلکہ تھوڑا سا وقت اور دو چار درہم رفاہ و فلاح حال مسلمانان کے لئے بھی نکالیں اور خیر دائم کی نیکی کو بھی حاصل کریں۔

سرسید کو اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کی کوششوں

میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان اس کار خیر کو محض ایک دنیاوی معاملہ سمجھتے تھے۔ اور اس کو اپنا دینی فرض اور افضل و اعلیٰ نیکی خیال نہ کرتے تھے۔ سرسید کو اپنی مشکلات کا احساس تھا اور وہ ان کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرستہ العلوم کی امداد کے سلسلے میں مولوی محمد علی حسن خاں کو لکھا تھا کہ ایک عام خیال نسبت حسنات و خیرات و مبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں۔

تقلید پرستی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے لئے ہے اور ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جو مذہب اس قدر ہمہ گیر، آفاقی اور دائمی ہو اس کو مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں نئے نئے مسائل حل کرنا ہوں گے۔ اور زمانے کے تقاضوں کو دینی اصول و مقاصد سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ ورنہ انسانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والا مذہب محض بے جان عقائد کا مجموعہ بن کر غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اسلام نے انسانی معاشرہ کی اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کو اجتہاد کرنے کا اختیار دیا ہے تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمانے کے نئے نئے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور اسلامی معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ لیکن جب مسلمان زوال پذیر ہو گئے تو انہوں نے اجتہاد کو ترک کر کے محض تقلید کا طریقہ اختیار کر لیا اور یہ فرض کرنے لگے کہ اجتہاد کی آزادی تو اماموں پر ختم ہو گئی ان کے بعد اجتہاد کی مطلق گنجائش نہیں اور اب مسلمانوں کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی امام کی تقلید کریں۔ تقلید کے اس غلط تصور نے اسلامی معاشرہ کی ترقی کو روک دیا اور وہ زوال پذیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت انتہائی پست ہو گئی اور مسلمانان عالم سے بہت دور ہو گئے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں میں تقلید کا یہ رجحان ان کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ اور ان کے زوال و ادبار کا ذمہ دار تھا۔ وہ اماموں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اور ہمیشہ اسی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند کر کے محض تقلید کرتے رہنے سے مسلمانوں اور اسلام کو بہت نقصان پہنچا ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان تقلید کے بارے میں اپنا نظریہ بدل دیں۔ چنانچہ محسن الملک کے نام

ایک خط میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن وحدیث سے صحیح حاصل ہوتی ہے تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کرسکیں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ائمہ کبار درکنار و مولوی حبو کی بھی تقلید کافی ہے۔ کیونکہ لا الہٰ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں دشمن اسلام ہوں یا مثلِ ابوبکرؓ و عمرؓ کے دوست اسلام ہوں میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباب من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔''

سرسید اسلام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی کے لئے اجتہاد کو لازمی خیال کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ متاخرین اہل سنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ بنایا ہے کہ اجتہاد ختم ہو گیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا۔ اکثر علمائے دین کا یہ مذہب ہے کہ ہر زمانے میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی اہل سنت و الجماعت کی ہے کہ اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مانتے ہیں۔ اسی غلط اعتقاد نے مسلمانوں کو دین و دنیا میں نہایت نقصان پہنچایا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس خیال کو چھوڑ دیں اور ہر بات کی تحقیق پر مستعد ہوں خواہ وہ بات دین کی ہو یا دنیا کی۔ غور کرنا چاہئے کہ ہر گاہ زمانہ حادث ہے اور نئے نئے امور اور نئی نئی حاجتیں ہم کو پیش آتی ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد موجود نہ ہوں گے تو ہم مردہ مجتہدوں سے نئی بات کا مسئلہ جو ان کے زمانے میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی کیوں کر پوچھیں گے۔ پس ہمارے لئے بھی مجتہد العصر والزمان ہونا ضروری ہے۔'' جو لوگ ائمہ کبار کے اجتہاد کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ہر حال اور ہر زمانے میں ان کی تقلید کرنے کے قائل ہیں وہ لوگ سرسید کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کا یہ غلط عقیدہ ائمہ کو وہ مرتبہ دینا چاہتا ہے جو صرف رسول کے لئے ہے۔ کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔''

سرسید نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو دینی گمراہی سے بچانے اور اصلاح و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ان کے عقائد درست کرنے کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں میں ایک فکری و ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی بنیاد بن گئیں۔ اور جدید دینی افکار کی تشکیل میں سرسید کے نظریات نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔

(بہ شکریہ ثقافت لاہور)

☆☆☆

طلوع اسلام (حاشیہ)

سرسیدؒ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے اصول فطرت (نیچر) کے عین مطابق ہیں۔ اس وجہ سے مخالفین انہیں نیچری کہہ کر پکارتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کی نگہ ژرف بیں نے دیکھ لیا تھا کہ اقوام مغرب' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے باقی دنیا کو بالعموم اور مسلمانوں کی دنیا کو بالخصوص اپنے تابع فرمان بنائے جا رہی ہیں اور مسلمانوں کو صدیوں سے یہ غلط سبق دیا جا رہا ہے کہ دنیا قابل نفرت ہے اور اس کے ترک کر دینے میں ہی انسان کی نجات ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس ذلت آفریں تعلیم کے شکنجہ سے نکال کر تسخیر فطرت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے فطرت پر اس قدر زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی کبھی ''انسانی فطرت'' کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں جیسا کہ طلوع اسلام میں متعدد بار اس حقیقت کو پیش کیا جا چکا ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ اس میں کچھ صلاحیتیں ہیں جن کی نشوونما کر کے ان سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا اسلام ہے۔ (تفصیل ان امور کی سلیم کے نام خطوط میں ملے گی) لہٰذا سرسیدؒ کے ہاں جہاں فطرت کا لفظ آئے وہاں اس سے مراد قوانین فطرت یا فطرت کی قوتیں لی جانی چاہئے۔ اسے انسانی فطرت پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوعمار زاہد الراشدی

دینی مدارس: علمی وفکری دائرے میں وسعت کی ضرورت

داخلی نصاب ونظام کے حوالے سے دینی مدارس کو ایک اور چیلنج یہ درپیش ہے کہ اسلامی ثقافت و اقدار کا تحفظ ان کے اہداف میں شامل ہے' لیکن جس مغربی ثقافت اور فلسفہ سے اسلامی اقدار وثقافت کو خطرہ درپیش ہے' اس سے واقفیت کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔ مغربی فکر و فلسفہ کیا ہے اور مغربی ثقافت واقدار کا پس منظر کیا ہے؟ اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی غالب اکثریت ناواقف ہے اور یہ افسوس ناک صورت حال ہے کہ جس دشمن سے ہم لڑ رہے ہیں' اس کی ماہیت' طریقہ کار' ہتھیاروں اور دائرہ کار سے ہمیں شناسائی تک حاصل نہیں ہے۔ مغربی فلسفہ ونظام اور ثقافت واقدار کا ایک تاریخی پس منظر ہے' اس کی ء اعتقادی بنیادیں ہیں' اس کا ایک عملی کردار ہے اور اسکا وسیع دائرہ اثر ہے' مگر دینی مدارس کے نصاب میں اس سے آگاہی کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے' حالانکہ ہمارے سامنے اسلاف کی یہ عظیم روایت موجود ہے کہ جب ہمارے معاشرے میں یونانی فلسفہ نے فروغ حاصل کیا تھا اور ہمارے عقائد کے نظام کو متاثر کرنا شروع کیا تھا تو ہمارے اکابر مثلاً امام ابوالحسن اشعریؒ' امام ابو منصور ماتریدیؒ' امام غزالیؒ' امام ابن رشدؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے یونانی فلسفہ پر عبور بلکہ برتری حاصل کی تھی اور اسی زبان اور اصطلاحات میں یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتراضات و شبہات کا جواب دے کر اسلامی عقائد کی حقانیت اور برتری ثابت کی تھی' ورنہ ایک دور میں یونانی فلسفہ ہمارے عقائد کے نظام میں اتھل پتھل کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دے رہا تھا۔ اس حوالے سے دینی مدارس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ مغربی فکر وفلسفہ کو بطور فن اپنے نصاب کا حصہ بنائیں' اس کے ماہرین پیدا کریں اور اسی کی زبان اور اصطلاحات میں شکوک وشبہات کے ازالہ اور اسلامی عقائد وثقافت کے تحفظ ودفاع کا اہتمام کریں۔

دینی مدارس کو درپیش ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ عالمی ماحول تو رہا ایک طرف' ہم عام طور پر اپنے اردگرد کے ماحول سے بھی باخبر نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اب

اردگرد کے ماحول اور عالمی ماحول میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اور مزید مشکل ہو جائے گا۔ یہ معلومات کی وسعت کا دور ہے' ہر چیز سے باخبر رہنے کا دور ہے اور حالات پر نظر رکھنے کا دور ہے۔ اس ماحول میں دینی مدارس کو اپنے اس طرزِعمل اور ترجیحات پر نظرِ ثانی کرنا ہو گی جو اپنے اساتذہ اور طلبہ کو بہت سے معاملات میں بے خبر رکھنے کے لئے ان کی پالیسی کا حصہ ہے۔ مثلاً:

☆ معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ انتہائی ضروری ہے' بالخصوص وہ چھ سات مذاہب جن کے پیروکار اس وقت دنیا میں وسیع دائرے میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مستقل ممالک اور حکومتیں قائم ہیں' مثلاً یہودی' عیسائی' ہندو' بدھ مت اور سکھ وغیرہ۔ ان کا تعارفی بلکہ اسلام کے ساتھ تقابلی مطالعہ دینی مدارس کے فضلا کے لئے ضروری ہے۔

☆ مسلم امہ کا حصہ سمجھے جانے والے اعتقادی اور فقہی مذاہب مثلاً اہل سنت' اہل تشیع' حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' ظاہری' سلفی' جعفری' زیدی وغیرہ کا تعارفی مطالعہ اور ان کی اصول اور تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی عصری مسلم فکری تحریکات' جو روایتی دائرے سے ہٹ کر ہیں' ان کے بارے میں ضروری معلومات سطحی اور نامکمل نہ ہوں بلکہ اصل ماخذ سے صحیح معلومات ہونی چاہئیں۔

☆ طب' سائنس' ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ وغیرہ کی عملی کارفرمائی سے بہت سے مسائل کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔ ان سے آگاہ ہوئے بغیر فتویٰ دینا یا مسئلہ بیان کرنا شرعی اصولوں کے منافی ہے' لیکن اس فرق کے ساتھ کہ فن کو حاصل کرنا اور چیز ہے' اور اس کے بارے میں ضروری معلومات رکھنا اس سے مختلف امر ہے۔

☆ عالمی اور علاقائی زبانوں سے واقفیت اور ان پر عبور ایک مستقل مسئلہ ہے۔ دینی مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا ایسا اہتمام کہ کوئی فاضل انگلش میں تقریر کر سکے یا معیاری مضمون لکھ سکے' سرے سے موجود نہیں ہے۔ ہماری عربی' کتاب فہمی تک محدود ہے اور سالہا سال کی تعلیم اور تدریس کے بعد بھی ہم عربی زبان میں اس سے زیادہ عبور حاصل نہیں کر پاتے کہ کتاب کو سمجھ لیں اور اس کو پڑھا سکیں۔ بول چال' فی البدیہہ تقریر اور مضمون نویسی کی صلاحیت حاصل کرنا ہمارے اہداف میں شامل نہیں ہے' بلکہ اپنی قومی زبان اردو میں بھی ہماری حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر فضلا اچھی اردو نہیں بول سکتے اور نہ ہی اردو میں ڈھنگ کا کوئی مضمون تحریر کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا افسوس ناک خلا ہے جس نے ہمیں ابلاغ کے شعبے میں بالکل ناکارہ بنا رکھا ہے۔

☆ ابلاغ کے جدید ذرائع مثلاً کمپیوٹر' انٹرنیٹ' ویڈیو

وغیرہ تک ہماری رسائی محل نظر ہے اور نہ صرف یہ کہ زبان اور ذرائع عام طور پر ہماری دسترس سے باہر ہیں' بلکہ اسلوب کے حوالے سے بھی ہم آج کے دور سے بہت پیچھے ہیں۔ ہماری زبان ثقیل اور اسلوب فتویٰ اور مناظرہ کا ہوتا ہے' جبکہ یہ تینوں باتیں اب متروک ہو چکی ہیں۔ آج کی زبان سادہ اور اسلوب لابنگ اور بریفنگ کا ہے' مگر ہم ان دونوں سے ناآشنا ہیں جس کی وجہ سے ہم خود اپنے معاشرہ اور ماحول میں ہی بسا اوقات اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں اور ابلاغ کی ذمہ داری پوری نہیں کر پاتے۔

☆ ہمارے ہاں عمرانی اور معاشرتی علوم کا ارتقا مسلم اسپین کے دور تک رہا ہے۔ اس کے بعد ایسی بریک لگی ہے جیسے ہمارے ہاں معاشرت اور عمرانیات کا ارتقا ہی رک گیا ہو۔ تب سے اس شعبہ میں ہم پر جمود طاری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اجتہادی کام کے علاوہ اس دوران میں کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دیتی اور شاہ صاحبؒ کے بعد بھی تین صدیوں سے سناٹا طاری ہے۔ معاشرت کا ارتقا تو ظاہر ہے' رک نہیں سکتا مگر معاشرت و تہذیب کے حوالہ سے ہماری سوئی ابھی تک مسلم اسپین پر اٹکی ہوئی ہے اور ہم اس سے آگے بڑھتے نظر نہیں آ رہے۔ اس جمود کو توڑے بغیر ہم معاشرت و تمدن اور ثقافت و عمرانیات کے بارے میں دنیا کی راہنمائی کا مقام آخر پھر سے کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ مگر دینی مدارس میں عمرانی علوم کے حوالے سے کوئی اجتہادی کام اور علمی پیش رفت تو رہی ایک طرف' ان علوم تک ہمارے فضلا اور اساتذہ کی رسائی بھی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

☆ دینی مدارس میں ہمارے اعتقادی اور فقہی مباحث اور اختلافات پر خوب کام ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ صرف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت اور اس اہمیت سے انکار نہیں' لیکن اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں۔ بسا اوقات اولیٰ اور غیر اولیٰ کے مسائل اور فروعی اختلافات کفر و اسلام کے معرکے کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی اصولی اور بنیادی مسائل بھی نظر انداز ہونے لگ جاتے ہیں۔ اعتقادی مسائل اور فقہی اختلافات پر ضرور بات ہونی چاہئے اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا چاہئے' لیکن اس کے ساتھ ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات بھی ان کے سامنے واضح ہونی چاہئے اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ کون سی بات کفر و اسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہے' کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔

☆ تحقیق کے حوالے سے ہمارے ہاں صرف تین شعبوں میں کام ہوتا ہے: (۱) اعتقادی و فقہی اختلافات پر

خوب زور آزمائی ہوتی ہے' (۲) افتاء میں ضرورت کے مطابق تحقیق ہوتی ہے' (۳) دینی جرائد میں عام مسلمانوں تک اپنے اپنے ذوق کے مطابق دینی معلومات پہنچانے کے لئے تھوڑی بہت محنت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ امت کی اجتماعی ضروریات اور ملت اسلامیہ کے عالمی ماحول کی مناسبت سے کسی تحقیقی کام کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ کچھ افراد اپنی ذوق اور محنت سے ایسا ضرور کر رہے ہیں' لیکن بحیثیت ایک ادارہ اور نیٹ ورک کے دینی مدارس کے پروگرام میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔

☆ معلومات کی وسعت' تنوع اور ثقاہت کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر بات کرتے ہوئے ہم میں سے اکثر کی معلومات محدود' یک طرفہ اور سطحی ہوتی ہیں۔ الا یہ کہ کسی کا ذوق ذاتی محنت اور توجہ سے ترقی پا جائے اور وہ اس سطح سے بالا ہو کر کوئی کام کر دکھائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق' مطالعہ اور استدلال و استنباط کے فن کو ایک فن اور علم کے طور پر دینی مدارس میں پڑھایا جائے اور طلبہ کو اس کام کے لئے باقاعدہ طور پر تیار کیا جائے۔

☆ دینی مدارس کی لائبریریوں کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے۔ گنتی کے چند بڑے مدارس کے استثنا کے ساتھ عمومی طور پر دینی مدارس کی لائبریریوں میں درسی کتابوں سے ہٹ کر جو کتابیں پائی جاتی ہیں' وہ کیف ما اتفق کے اصول پر کسی منصوبہ بندی اور ہدف کے بغیر ہوتی ہیں۔ ان تک طلبہ کی رسائی اور استفادہ کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض مدارس میں تو روزانہ اخبارات کا داخلہ بھی بند ہوتا ہے اور طلبہ پر پابندی ہوتی ہے کہ وہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ خدا جانے اپنے طلبہ کو دنیا' اپنے ملک اور اردگرد کے ماحول سے بے خبر رکھ کر یہ مدارس انہیں کون سے ماحول میں کام کرنے کی تربیت دے رہے ہوتے ہیں۔

☆ مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کی ضرورت بھی دن بدن عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی طرف بین الاقوامی حلقے متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مکالمہ کے اصل فریق کون ہیں اور مکالمہ کا ایجنڈا کیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر الگ سے گفتگو ہونی چاہئے' لیکن مذاہب کے درمیان مکالمہ جس انداز سے آگے بڑھ رہا ہے' اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا بے خبر اور لاتعلق رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس مکالمہ کے پس منظر' ضرورت' دائرہ کار اور مضرت و منفعت سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا آگاہ ہونا ضروری ہے' بلکہ اس مکالمے کے تو اصل فریق ہی دینی مدارس ہیں اور انہیں اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرنا چاہئے۔

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ' اپریل 2006ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

اسلامی نظام کے بارے میں دو اہم نکات کی وضاحت

کمترین راقم سطور کے چھ (۶) مضامین اسلامی نظام کے سلسلہ میں موقرہ جریدہ 'طلوع اسلام' اور دیگر رسائل میں طبع ہوئے۔ 'سلیم کے نام خطوط' کی دوسری جلد کا چوبیسواں خط ''اطاعت رسول'' نام کا میرے تمام مضامین کا محور تھا۔ اس خط میں ہی تحریر کردہ فقروں کو میں نے اپنے مضامین کا عنوان قرار دیا تھا اور انہیں فقروں کو میں نے نہایت درجہ Elaborate کیا۔ یہ مضامین ''اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی''۔ ''انسانوں کے باہمی معاملات کو وحی کے مطابق طے کرنا دین ہے'' ''دین کے اجزاء مملکت کی بنیاد ہوتے ہیں''۔ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا خود ایک مستقل قدر ہے''۔ ''خدا اور رسول کی اطاعت کی عملی شکل دین کی اطاعت ہے''۔ طبع ہوئے اور ان تمام مضامین میں میں نے اسی ''سلیم کے نام'' خط کے مرکزی نقطہ کی مختلف اسالیب سے خوب خوب وضاحت کی ہے کیونکہ یہ نظریہ تحریک عالیہ طلوع اسلام کا ایک ایسا منفرد و بے مثل نظریہ ہے کہ جس کی کوئی کرن تک ساری دنیا میں کسی ملک میں بھی دکھائی نہیں دیتی اور صرف اسی نظریہ کو درست تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو عروج و اقتدار حاصل ہوسکتا ہے۔ ان مضامین کو باوجود ان کی ندرت و انفرادیت کے قارئین کرام نے بہت پسند فرمایا اور بہت حد تک سراہا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے بارے میں اعتراضات و استفسارات بھی بڑی تعداد میں، ای میل اور خطوط کے ذریعے موصول ہوئے۔ ہمارے علمائے کرام نے جب تحریک طلوع اسلام کی مخالفت شروع کی، اور جسے وہ اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں زیادہ تر طلوع اسلام کو انکار حدیث سے مطعون کرتے چلے آرہے ہیں لیکن اس موضوع پر انہوں نے زیادہ توجہ نہیں فرمائی اور صرف چند حضرات نے ہی مرکز ملت کے تصور کی تردید میں کچھ تحریر کیا ہے۔

زمانہ کے تھپیڑوں، مسلمانوں کے زوال و ادبار، حالات کے تقاضوں سے مجبور ہوکر اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت تک تو عام مسلمان آگئے ہیں لیکن اس سے آگے جو

اصل مرکزی ومحوری عقیدہ کہ اللہ کی اطاعت صرف اس نظام کی وساطت سے ہوسکتی ہے اور بغیر اس نظام کی وساطت کے براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوسکتی' اس نقطہ تک مسلمان آنے کو اب بھی تیار نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نقطہ ان کے سامنے کبھی پیش ہی نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ بغیر نظام قائم کئے بھی قرآن وحدیث کے ذریعے اللہ کی براہ راست اطاعت کرنے کو درست خیال کرتے ہیں۔ اس میں Core Issue' حدیث کے مقام کے صحیح تعین کرنے کا Involve ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت صرف نظام کی وساطت سے ہوتی ہے۔ اس میں اللہ ورسول دونوں کی اطاعت شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کا اصرار ہے کہ رسول کی اطاعت صرف احادیث کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوتی۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ان بے شمار اعتراضات وسوالات کی طرف آتے ہیں جو ان مضامین کے سلسلہ میں بذریعہ ای میل یا خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان اعتراضات کی کثرت سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے ان مضامین کو نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان پر غور و خوض بھی کیا۔ اکثر سوالات کے جوابات مستفسر حضرات کو ارسال کر دیئے گئے ہیں ان سوالات میں چند ایسے اصولی سوالات ہیں کہ ان کے متعلق یہ خیال ہوا کہ ان کو رسالہ میں طبع کرا دیا جائے تا کہ دیگر حضرات کو بھی اس سے اطلاع ہو۔

اسلامی نظام میں اطاعت رسول کے بارے میں ایک صاحب نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ اپنے دور میں حضورﷺ نے جو جزئیات مقرر فرمائیں' تو ان کی اطاعت سے تو حضورﷺ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ لیکن بعد کے ادوار میں جب حضورﷺ کی مقرر کردہ جزئیات کو ہی تبدیل کر دیا جائے تو پھر ان تبدیل شدہ جزئیات کی اطاعت سے حضورﷺ کی اطاعت نہیں ہوسکتی' تو اس طرح تو ہم حضورﷺ کی اطاعت کرنے سے محروم ہو گئے اور یہ بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔

اسلامی نظام میں رسول اللہ کی اطاعت کے بارے میں یہ سوال اکثر حضرات کے ذہن میں آتا ہے اور ان کی خلش کا باعث ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک قرآن کریم محفوظ ہے' جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہوا ہے' اور جب تک ہمارا قرآن کریم پر ایمان ہے' اس وقت تک ہمارا حضورﷺ کی رسالت پر ایمان ہے۔ بے شک حضور ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہونے اور اس پر عمل کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ہم حضورﷺ کی عدم موجودگی کے باوجود ان کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے نظام کی صورت ہے کہ جب بھی وہ نظام قائم ہوگا' کیونکہ وہ قرآنی

احکامات پر قائم ہوگا جو ہمیں حضورﷺ کی معرفت ملے' اس لئے ان کی اطاعت میں ہی حضورﷺ کی اطاعت مضمر ہو گی۔ اہمیت جزئیات کی نہیں ہے' اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ نظام حضورﷺ نے عنایت فرمایا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے اصول و احکام بھی عنایت فرمائے ہیں جن میں قیامت تک تبدیلی نہیں ہوگی۔ ان کی جزئیات تبدیل ہی نہیں ہوں گی۔ اگرچہ ان احکام میں حضورﷺ نے کوئی جزئیات مقرر نہیں فرمائیں تاہم ان کی اطاعت سے حضورﷺ کی اطاعت ہوگی۔ وراثت کے تمام احکام اور عائلی زندگی کے بیشتر احکام وہ ہیں جن کی جزئیات کے سلسلہ میں حضورﷺ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن چونکہ وہ اسلامی حکومت کے احکام ہیں اس لئے ان کی اطاعت کرنے سے حضورﷺ کی بھی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی طرح روزہ' خمس اور دیگر امور ہیں۔ خمس کے حصے خود مقرر ہیں۔ زانی کی سزا' سو دروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اسی قبیل کے اور اصول بھی ہیں جو قرآن میں تفحص کرنے کے بعد جمع کئے جاسکتے ہیں' ان کی اطاعت بھی حضورﷺ کی اطاعت ہے۔

لیکن جن امور میں جزئیات تبدیل بھی ہوئیں ان تبدیل شدہ جزئیات کی اطاعت بھی حضورﷺ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ اصل اطاعت اس نظام کی ہے۔ جزئیات کی نہیں مثلاً قرآن کریم میں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نازل ہوا۔ جس سے یہ حکم تھا کہ اسلامی مملکت ہر فرد کی معاشی ضروریات پوری کرے' کوئی دوسرے کا دست نگر نہ رہے۔ سب کی جسمانی پرورش اور انسانی ذات کا ارتقاء ہو سکے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے حضورﷺ نے انتظام فرمایا' جو صاحب استطاعت لوگ تھے ان سے لیا اور ضرورت مندوں کو دیا۔ اس کے لئے ان کے خیال مبارک کے مطابق اڑھائی فیصد مال کی ادائیگی کافی ہوگی لیکن ''خدا و رسول کی اطاعت'' سے یہ مراد نہیں تھی کہ زکوٰۃ دینے سے اللہ کے حکم کی اطاعت ہوگئی اور اڑھائی فیصد دینے سے رسول کی اطاعت ہوئی۔ بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ اس وقت کے اسلامی نظام میں اڑھائی فیصد دینے سے اللہ و رسول کی یہ اطاعت پوری ہو جاتی تھی کہ اس سے مملکت کے ہر فرد کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ اگر صرف حضور کی مقرر کردہ جزئیات سے ہی حضور کی اطاعت ہوتی تو علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المہدین (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی اطاعت لازم ہے) کی سنت کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ اور خلفائے راشدین کسی خاص دور تک کے لئے مخصوص نہیں تھے۔ اگر قرآن کا وہ نظام قائم رہتا تو حضرت ابوبکرؓ سے لے کر آج تک کے تمام خلفاء' خلفائے راشدین ہی ہوتے اور ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی۔

نظام میں اصول و جزئیات الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک Integrated اکائی ہوتی ہے۔ یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ کسی ایک جز سے اتفاق نہ ہو' لیکن پھر بھی اس نظام کی اطاعت جاری رکھیں۔ مثلاً جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تو بعض صحابہؓ ذاتی طور پر اس جہاد کے خلاف تھے۔ اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی فوجیوں کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی تو بہت سے صحابہؓ کو اس سے اتفاق نہیں تھا لیکن ان جزئیات کے اختلاف کے باوجود وہ نظام کی اطاعت کرتے رہے۔

یہ تو ان صاحب کے اعتراض کا تحقیقی جواب تھا' جو پیش خدمت عالی کیا گیا ہے۔ اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورﷺ نے سب جزئیات وحی خفی کے ذریعے مقرر فرمائی تھیں' اسی لئے وہ ان میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں۔ جب یہ جزئیات بقول ان کے خود وحی خفی کی رو سے طے ہوئیں' تو ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے۔ وحی کی اطاعت سے تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ خواہ وہ جلی ہو یا خفی۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ حضرات وحی جلی کی اطاعت سے تو اللہ کی اطاعت تسلیم فرماتے ہیں اور وحی خفی کی اطاعت کو حضور کی اطاعت قرار دیتے ہیں۔ فتدبروا۔

ان ہی مذکورہ بالا مضامین کو مطالعہ فرما کر ایک اور صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض اوقات ان دونوں حضرات کے خلاف الزامات لگائے گئے اور یہ دونوں حضرات عدالتوں میں بھی حاضر ہوئے اور نہ صرف یہ کہ یہ دونوں حضرات عدالتوں میں حاضر ہوئے بلکہ ان عدالتوں میں فیصلہ بھی ان دونوں کے خلاف ہوا تھا۔ اگر ان دونوں حضرات کی اپنی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی تو انہوں نے عدالتوں کے فیصلوں کی کیوں اطاعت کی۔ خود حاکم ہوکر محکوم عدالتوں کی اطاعت کیوں کی۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی خود کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

ضمناً و طبعاً یہ عرض ہے کہ بعض حضرات کو معاملات کو الجھا کر پیش کر کے' دوسروں کو لاجواب کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ یہ حضرات Logic و Discursive کے ماہر ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں یونانی علوم کے زیر اثر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غور و خوض کا سلسلہ شروع ہوا تو گویا ایک Pandora Box کھل گیا۔ وضع وضع اور طرح طرح کے سوالات ہونے شروع ہوئے۔ اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا پتھر بنا سکتا ہے کہ وہ خود اس کو اٹھا نہ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال صرف دوسرے کو عاجز کرنے کی خاطر کیا گیا اسی طرح کا واقعہ ہے کہ چند لوگوں نے حضرت علی مرتضیٰ سے دریافت کیا کہ بھیڑ (Lamb) اور کتے کے اختلاط سے جو بچہ پیدا ہو وہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اس پر آنجنابؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو بھیڑوں کے ریوڑ میں چھوڑ دو' اگر وہ

ریوڑ کے درمیان چلتا ہے وہ بھیڑ ہے اور حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ وہ صاحبان تو محض تنگ کرنا چاہتے تھے' اس لئے وہ چند روز بعد آئے اور کہنے لگے کہ وہ کبھی تو ریوڑ کے درمیان چلتا ہے اور کبھی ریوڑ سے آگے چلتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ پھر اسے پانی پلاؤ اگر وہ کتے کی طرح آواز پیدا کر کے پانی پیتا ہے تو حرام ہے ورنہ حلال۔ انہوں نے پھر آ کر یہی جواب دیا کہ وہ کبھی کتے کی طرح پیتا ہے اور کبھی بھیڑ کی طرح۔ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو ذبح کر لو اگر اس کے اوجڑی (Offal) نکلے تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ ان کا مقصد تو صرف سوالات کر کے تنگ کرنا تھا اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

بہرحال ان صاحب کے جواب کے سلسلہ میں عرض ہے کہ بے شک حضرت عمرؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی اور یہ اطاعت اس دور کے ساتھ مخصوص تھی۔ جب وہ حکومت کے سربراہ تھے۔ اس سے پیشتر کے عرصہ میں اطاعت کی یہ صورت نہیں تھی اور بے شک وہ محترم و مکرم حضرات اس سے واقف بھی تھے لیکن وہ خود بھی تو اس نظام کی اطاعت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف دوسروں سے اس کی اطاعت کراتے تھے' بلکہ وہ خود بھی اس نظام کے تابع تھے۔ ہمارے ملک کے صدر یا وزیراعظم جب اپنی کار میں سڑک پر سے گذرتے ہیں تو وہ چوراہے پر ٹریفک کانسٹیبل کے اشاروں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اصل میں چوک کے سپاہی کی اطاعت اس کی اپنی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے جسے خود صدر یا وزیراعظم جاری کرتے ہیں۔ یہاں نظام کی اطاعت اور شخصی اطاعت میں بڑا لطیف فرق ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ نے اپنی ماتحت عدالتوں کی اطاعت کرنے میں اس مقامی قاضی کی شخصی و ذاتی اطاعت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس عدالت کی اطاعت کی جو مرکز کے احکامات نافذ کر رہی تھی اور مرکز کے احکامات کی اطاعت تو وہ دونوں حضرات خود بھی فرماتے تھے۔

میرے محترم مستفسر نے بجائے خویش یہ نکتہ اعتراضاً پیش فرمایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی حکومت اور سیکولر حکومتوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ سیکولر حکومت میں قانون تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ قانون کی مخالفت کرنے اور حدود سے تجاوز کرنے کے بعد اس حکومت میں نہ کہ را منزلت ماشد نہ را۔ وہاں تو یہ حکم ہے ولا تاخذکم بھما رافة فی دین اللہ (۲/۲۴) (اے رسول' مجرمین کے معاملہ میں قانون خداوندی کے مطابق سزا دینے میں ذرا نرمی نہ کی جائے۔ یہ دونوں حضرات حضورﷺ کے تربیت یافتہ تھے جو کچھ انہوں نے کہا یہ اسی کا اثر تھا جو انہیں حضورﷺ سے تربیت میں ملا تھا کیونکہ حضورﷺ نے ہمیشہ بشریت اور رسالت کا باریک فرق پیش نگاہ رکھا جس کی بے شمار مثالیں' تاریخ میں ملتی ہیں اور جس سے ہمارے علماء کرام خوب واقف ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

اطاعتِ رسول ﷺ کا توسط

قرآن کریم کے احکام وقوانین کا مقصد ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اسکے لئے اطاعت اور اتباع کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم تو اتباع کا بھی اطاعت ہی ہے، لیکن ان میں ایک لطیف سا فرق ہے۔ اطاعت ان احکام کی جاتی ہے جو کسی اتھارٹی کی طرف سے صادر ہوں۔ الدین، قرآنی نظام کا نام ہے جس میں اطاعت ان احکام کی جاتی ہے جو اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس لئے اطعنا کے ساتھ سمعنا کو لازم قرار دیا گیا ہے یعنی ہم نے سنا اور اس کی اطاعت کی (64:16,24:51,2:285,5:7)۔ اس نظام کی اطاعت کو قرآن نے ''اللہ اور رسول ﷺ'' کی اطاعت کہہ کر پکارا ہے (9:63,9:24,8:20,4:59,3:31)۔ جس طرح ایک (گائے کا) نوزائیدہ بچہ اپنی ماں (گائے) کے پیچھے پیچھے چلتا ہے عرب اسے اتباع سے تعبیر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بچھڑا کسی خارجی حکم کی اطاعت کرتا ہوا اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتا یہ اس کی اندرونی کشش کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ راستے پر اس قسم کی کشش اور اندرونی تقاضا کی رو سے چلنے کا نام اتباع قرآنی ہوگا۔ جس طرح جب پیاس لگتی ہے تو انسان اٹھ کر پانی پیتا ہے۔ یہ ایسا کسی کے حکم کی اطاعت کی رو سے نہیں کرتا۔ اندرونی تقاضے کی رو سے کرتا ہے۔ اسے اتباع کہتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور حکمرانوں کے حکم کی اطاعت۔ یہ نقطہ بڑا لطیف ہے کہ قرآن کے لئے اطاعت کا لفظ کہیں نہیں آیا، اتباع کا لفظ ہی آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرد کتاب کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اطاعت ایک اتھارٹی کی رو سے ہی کی جاسکتی ہے۔ قانون خداوندی کی رو سے اطاعت رسول ضروری ہے (4:64) اور قرآن کی رو سے ایمان کا مظاہرہ اطاعت رسول ﷺ سے ہوتا ہے (24:62)۔ چونکہ رسول ﷺ کی اطاعت کرنے والا خدا کی اطاعت کرتا ہے (4:80) اس لئے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک رسول ﷺ کو اپنا حکم نہ تسلیم کرے (4:65)۔ قرآن ہدایت یعنی (راہنمائی) عطا کرتا ہے۔ ایک رہرو جو سمجھ سوچ کر کسی راہنما کے پیچھے چلتا ہے، تو وہ اس کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کرتا وہ خود اپنے اندرونی تقاضا کی رو سے ایسا کرتا ہے، یہ اتباع ہے۔۔۔ اگرچہ خود لفظِ اطاعت میں بھی، بطیبِ خاطر تعمیل کا پہلو مضمر ہوتا ہے، لیکن حکومت کے احکام کی اطاعت، میکانکی طور بھی کی جاسکتی ہے، اور یہ اطاعت قانونی تقاضا پورا کر دیتی ہے۔ لیکن انسانیت کے بیشتر تقاضے ایسے ہیں جو اس قسم کی

اطاعت کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتے (مثلاً) اس قسم کی ہدایت کہ بوڑھے ماں باپ سے درشت کلامی سے پیش نہ آؤ (17:23)۔ چلّا کر نہ بولو (31:19)۔ اکڑ کر مت چلو (31:18)۔ اس قسم کی ہدایات پر قانوناً عمل نہیں کرایا جا سکتا۔ ان کا اتباع اندرونی تقاضا ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے (13:11)۔ اس اندرونی تبدیلی کا مظاہرہ اتباع ہدایتِ خداوندی کی شکل میں ہوتا ہے۔ احکام کی اطاعت سے معاشرتی نظم ونسق قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن قوم میں حقیقی تبدیلی اتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ قرآنی نظام میں اطاعت اور اتباع دونوں لازمی ہیں۔۔۔ یعنی ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر کردہ احکامِ خداوندی کی اطاعت اور قلبی تقاضا کی رو سے منشائے خداوندی کی تکمیل۔ اسلام کے صدرِ اول میں جو نظام قائم ہوا تھا' اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ بعد میں جب اس نظام کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اسلام کا نظام ہی ختم ہو گیا۔

مسلم سلاطین نے رعایا سے قرآنی احکام کی بجائے اپنے احکام منوانے شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے اطاعتِ ''خدا و رسول ﷺ'' کا مفہوم اس طرح بدلا کہ اس میں نظام (یا زندہ اتھارٹی) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی اطاعت سے مراد ہے کتاب اللہ کی اپنے اپنے طور پر اطاعت اور اطاعتِ رسول ﷺ سے مراد ہے روایات کے ذریعے احادیث کی اطاعت۔ اس میں سمعنا (ہم نے سنا) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس طرح دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے فقہ کے قوانین مرتب کئے گئے اور عقیدہ یہ پیدا کیا گیا کہ احکامِ فقہ کی اطاعت' خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف ہے۔ اس سے تھیاکریسی وجود میں آ گئی اور امت فرقوں میں بٹ گئی۔ باقی رہا اتباع تو اس کے لئے بزرگوں کے نقوشِ قدم کی پیروی شروع ہو گئی (یعنی مسلکِ اسلاف اور مرشدانِ طریقت کے منہاج کی پیروی' جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اور یہی ہے وہ اسلام جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم نے اتباع کے لئے' صرف کتاب اللہ میں عطا فرمودہ راستہ بتایا تھا۔ اللہ کے سوا کسی بھی اولیاء کے اتباع سے منع کیا تھا یعنی کتاب اللہ کے سوا' ہر مسلک ومشرب کے اتباع کی مخالفت کی تھی (7:3)۔ لیکن مروجہ اسلام میں قرآنِ کریم تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا' اور اتباع کے لئے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیتیں مقرر کر لی گئیں۔

اللہ نے **اھدنا الصراط المستقیم** دعا سکھائی ہے تو ساتھ دوسرے مقام پر یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تم رسول ﷺ کی اطاعت کرو گے' تو تمہیں صحیح راستے کی طرف راہنمائی مل جائے گی (روگردانی کرو گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتو گے (24:54)۔ خدا نے اپنے رسول ﷺ کو اپنی اطاعت کروانے کے لئے ضابطۂ ہدایت یعنی دین الحق (Constitution) دے کر بھیجا جسے آپ ﷺ نے سب سے پہلے عملی طور پر مدینہ منورہ میں قائم (Establish) کیا (9:33)۔ لہٰذا سربراہ مملکت کی حیثیت سے حضور ﷺ کی اطاعت کا واحد ذریعہ قرآنی حکومت تھی آپ ﷺ کے اتباع میں خلفائے راشدین کی طرح آج بھی خلافت علیٰ منہاج رسالتؐ ضروری ہے اس

کے سوا کسی اور نظام کے تحت زندگی بسر کرنے سے اطاعتِ رسول ﷺ کا فریضہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دن میں پانچ بار نماز کی ہر رکعت میں ہدایت کے لئے دعا اور آرزو سے ہماری روش ایسی ہے جیسے کوئی پیاسا دریا کے کنارے کھڑا' بغیر کسی ذریعہ Without any Means, Agency, Sourse دور سے' پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر سمجھے کہ پانی اس کے منہ تک خود پہنچ جائے گا۔ حالانکہ اس طرح پانی اس کے ہونٹوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا (کیونکہ یہ چیز قانونِ خداوندی کے خلاف ہے) لہٰذا اس کے قانون سے انکار کرنے والوں کی آرزوئیں بارآور نہیں ہوسکتیں (13:14)۔

حدیثِ رسولؐ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب میرا نام سنا کرو تو کہا کرو **صلی اللہ علیہ وسلم**۔ اس سے مفہوم لیا جاتا تھا کہ اے اللہ آپ ﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہماری جدوجہد کو پروان چڑھا۔ O Allah prosper our efforts by means of his obedience لیکن خلفائے راشدین کے بعد مسلمانوں کے ہاں اس کا مطلب لیا جانے لگا اے اللہ آپ ﷺ پر درود وسلام بھیج' بعض کے نزدیک آپ ﷺ پر رحمت بھیج اور کسی نے اس کا ترجمہ Peace be upon him ذہنوں میں راسخ کر دیا تو ہم رحمۃ للعٰلمینؐ کو بھی ان کے مقام محمود سے کھینچ کر نیچے لے آئے اور خود بھی ذلت اور رسوائی کے گڑھوں میں گرتے چلے گئے۔ اسلام کے نام سے حاصل کئے گئے پاکستان میں رہنے والو! بغیر خلافتِ علیٰ منہاج رسالتؐ پھر کیف یھدی اللہ؟۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبداللہ ثانی

قوم اور قومیت

یاددہانی کے لئے عرض ہے کہ محترم عزیز اللہ بوھیو صاحب نے ''سیکولرازم اور دوقومی نظریہ قرآن کی نظر میں'' پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ سیکولرازم پر راقم کی پہلی قسط قارئین کی نذر کر چکا ہوں۔ دوقومی نظریہ پر جواب حاضر خدمت ہے۔ محترم بوھیو صاحب نے دو قومی نظریے کو خلاف قرآن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان کی رسائی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنے تحفظات کو بھی ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ دوقومی نظریے کے سلسلے میں ان کی بحث کا ابتدائیہ کچھ یوں ہے:

''لفظ قوم کی معنی ومفہوم: جو افراد' جو لوگ' جو گروہ' جو جماعت جن جن اطوار' عادات' افعال' اوصاف' افکار' ونظریات اور کئی سارے اقدار مشترکہ میں شریک ہوں گے یا افعال و اوصاف سے متصف ہوں گے اور موصوف ہوں گے وہ اُن اُن ناموں کی قومیں کہلائیں گے۔ اگر جو کوئی انسانی گروہ ظالم ہونے کے حوالے سے مشہور اور موصوف ہے تو ان کو قوم الظالمین کہا جائے گا۔ پھر اس قوم ظالمین کے افراد کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ نسلی لحاظ سے ایک ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی بھی شخص ظالم اس کی قوم بنگالی ہے' سندھی ہے' پنجابی ہے' تاجک ہے' کوئی بھی ہو اگر ان سب قوموں میں ظلم کرنے والے لوگ چن کر جدا کئے جائیں گے تو یہ سب قوموں سے لئے ہوئے ظالم جدا جدا نسل ہونے کے باوجود قوم ظالمین ہونے میں یکساں طور پر شمار کئے جائیں گے۔ اب اس مثال پر اس طرح کی دوسری اوصاف بھی مراد ہیں۔ قوم الفاسقین' قوم مسرفین' قوم المجرمین' قوم العابدین' قوم الصالحین' تو اس طرح سے جو لوگ ہم صفت اور مشترک اقدار میں شریک ہوں گے تو وہ ان قدروں کے نام کی قوم کہلائیں گے پھر اس میں نسلی مشارکت وطنی جاگرافیکل مشارکت بھی ایک نسل میں شریک لوگ کوئی سی جدا جدا اوصاف رکھنے کے

باوجود افکار اور نظریات رکھنے کے باوجود نسل کے لحاظ سے اس نسل کی قوم سے بھی شمار ہوسکیں گے''۔

اس لمبے اقتباس کے ایک ایک فقرے پر غور کرنے سے تضادات کا ایک مجموعہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی طرح کئی دوسرے اقتباسات کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔ تب جا کر قوم کا ایک جامع تصور ابھر کر سامنے آئے گا۔

محترم بوھیو صاحب نے قوم کے جو معنی و مفہوم بتائے ہیں۔ ان میں چند کا سرے سے کوئی لگاّ قوم کے ساتھ نہیں ہے۔ کسی وصف سے متصف ہونے والے لوگ قومیت کے زمرے میں تو آسکتے ہیں لیکن قوم کے زمرے میں نہیں آسکتے۔ قومیت قوم ہی سے ماخوذ ہے۔ عربی زبان ایک قدیم زبان ہے۔ فارسی' اردو اور پشتو کی پڑوسی ہونے کی وجہ سے کئی الفاظ عربی سے محولہ تینوں زبانوں کو منتقل ہوئے ہیں۔ اس طرح قوم کا لفظ چاروں زبانوں میں مستعمل ہے۔ البتہ اس کا اس صفت بشکل اسم تصغیر قومیت عربی میں رائج نہیں۔ جبکہ فارسی' اردو اور پشتو میں عام ہے اور اپنے چھوٹے پن یا علاقائی وابستگی کے طور پر مستعمل ہے۔ مثلاً آپ نے ہمیشہ سنا ہوگا کہ پاکستان میں چار قومیتیں ہیں۔ لیکن اگر اسے وسیع معنی میں لیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ پاکستانی قوم۔ اس صورت میں کبھی کوئی نہیں کہتا کہ پاکستانی قومیت۔ میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ جب پوچھا جائے کہ آپ کی قومیت کیا ہے تو اس سے مراد ان چار قومیتیوں میں سی کسی ایک کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ سائل ملک سے وابستہ قومیت (قوم) کا سوال کرتا ہے۔ آیئے اب ذرا بڑی بڑی لغات سے قوم' قومیت' عادات' اوصاف' افعال اور نظریات کے معانی دیکھیں۔

قوم: قیاماً۔ کھڑا ہونا۔ متوازن ہونا۔ کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا۔ محکم اور استوار ہونا۔ ثابت اور دائم رہنا۔ کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا۔ رک جانا بارونق ہونا۔ (لغات القرآن' ص ۱۳۹۹)۔

القوم: لوگوں کی جماعت۔ اقاوِم۔ قوم الرجل۔ قریبی رشتہ دار جو ایک دادا میں شریک ہوں۔ (مصباح اللغات' ص ۷۰۴)۔

قوم: قامَ۔ یقومُ۔ قیاماً۔ کھڑا ہونا۔ قیام کی کئی قسمیں ہیں۔ یقیمون الصلوٰۃ۔ صلوٰۃ کا کام جاری رکھتے ہیں اور اس کا خیال و نگرانی بھی رکھتے ہیں۔ وجعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس۔ اللہ نے عزت کا گھر کعبہ لوگوں کے لئے نظام و سہارا بنایا جس سے ان کی معاش و معاد قائم و ثابت رہے گی۔

(المفردات باالراغب' ص ۳۵۹)۔

قوم: شعب۔ People- Nation۔

قومی: شعبی۔ وطنی۔ National۔

قومیۃ مشترکہ: Common Citizenship۔

قوم الشئ: To Straigten, make right or correct.

قامَ: To rise ۔ (قاموس عربی۔انگریزی، ص ۵۷۰)۔

قوم: (اسم) واحد مذکر۔ خاندان۔ عام خلق۔ عوام۔ ڈڈیرو قبیلو مجموعہ۔ (کئی قبیلوں کا مجموعہ) (عربی)۔ پشتو ڈکشنری۔ دریاب، ص ۱۰۰۱)۔

قومیت: (اسم)۔نسل۔ذات۔اصل۔

نظریہ: (اسم واحد۔عربی) مونث۔ هغہ مسئلہ چی پکبن دغور وفکر نہ کار واخستے شی۔ یعنی وہ مسئلہ جس میں غور وفکر سے کام لیا جائے۔ (پشتو ڈکشنری، ص ۱۲۴۹۔ دریاب)۔

اوصاف: وصف کی جمع ہے۔ کسی خصوصیت یا خوبی کا حامل ہونا۔

یاد رہے۔ یہ ایک انفرادی عمل ہے جس کا اطلاق کسی طور بھی کسی اجتماعی عمل پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح افعال اگرچہ جمع صیغہ ہے لیکن فعل کے اعتبار سے ایک شخص کے کئی افعال ہو سکتے ہیں۔ اس کا تعلق بھی اجتماعی نہیں ہو سکتا۔ چند افراد مل کر اگر ایک فعل کریں تو اسے قومی فعل نہیں کہا جا سکتا۔ اب اگر قرآن کریم میں بعض افعال کے ساتھ قوم کا لفظ یا اصطلاح آئی بھی ہو تو اسے اسم تصغیر کے معنی میں لیا جائے یعنی قوم ظالمین جو ایک وسیع قوم میں چھوٹی قومیت کے افعال کے مرتکب ہوں۔ اب ذرا دیئے گئے معانی پر قرآن کریم کا حوالہ دے کر آگے بڑھتے ہیں۔

ظالمین کا لفظ قرآن کریم میں نو مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح ظالمون کا لفظ سات مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن کسی ایک مقام پر بھی قوم الظالمین یا قوم الظالمون کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

قوم الفاسقین۔ یہ اصطلاح قرآن کریم میں چھ مقامات پر استعمال ہوئی ہے اور سب کے ساتھ قوم کا لفظ آیا ہے جبکہ فاسقون سات مقامات پر آیا ہے اور کسی کے ساتھ قوم استعمال نہیں ہوا۔ کیوں آیا ہے۔ غور طلب ہے۔

قوم مسرفین۔ ایک مقام پر اور قوم مسرفون دو مقامات پر آیا ہے۔ ۵/۴۳، ۸۱/۷، ۱۹/۳۶۔

قوم مجرمون۔ ایک مقام پر آیا ہے۔ ۲۲/۴۴۔ جبکہ دوسرے مقام پر نہیں۔ ۴۶/۷۷۔

قوم مجرمین۔ تین مقامات پر آیا ہے۔ ۱۳۳/۷، ۷۵/۱۰، ۵۸/۱۵ جبکہ بقیہ چھ مقامات پر قوم استعمال نہیں ہوا۔ اسی طرح قوم طاغون بھی آیا ہے۔

قوم عابدین۔ ایک مقام پر آیا ہے ۱۰۶/۲۱ اور دو مقامات ۵۳/۲۱، ۷۳/۲۱ میں قوم استعمال نہیں ہوا۔

اسی طرح عابدوں کے ساتھ قوم کا لفظ استعمال نہیں ہوا جو کہ چار مقامات ۱۳۸/۲، ۴۷/۲۳، ۳/۱۰۹، ۵/۱۰۹ پر نہیں آیا۔ غور طلب یہ ہے کہ فاسقین اور عابدین کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

قوم الصالحین۔ ایک مقام ۹/۱۲ پر استعمال ہوا جبکہ بقیہ تین مقامات ۲۵/۱۷، ۲۱/۷۲، ۱۰/۶۶ پر نہیں

ہے۔

مجموعی طور پر قوم کا لفظ ۱۲۶ مقامات، قوماً کا لفظ چالیس مقامات اور قومک کانو، قومنا کا لفظ چار مقامات، یٰقومنا دو مقامات، قومِہ چھتیس مقامات، قومھا ایک مقام، قومھم سات مقامات اور قومی پانچ مقامات پر آیا ہے۔ ان تمام مقامات کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو واضح طور پر دو قومی نظریہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

ہم کبھی بھی اس سے انکار نہیں کریں گے کہ نسلی اعتبار سے بھی کوئی شخص کسی قوم کا فرد ہو سکتا ہے لیکن اسے وسیع تصور سے نکال کر قبیلے کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر کئی نسلی لحاظ سے مختلف قبیلے اکٹھے ہو جائیں تو انہیں قبائلی قوم کہا جا سکا ہے۔ ان چند قبائل کو اگر مزید گہرائی سے دیکھا جائے تو ان میں کسی ایک وصف میں ٹھہراؤ۔ کھڑا ہونا۔ متوازن ہونا۔ کسی معاملے کا اعتدال اور توازن پر ہونا۔ محکم اور استوار ہونا نظر نہیں آئے گا۔ اس طرح ہر قبیلے کے اپنے عادات واطوار ہوں گے۔ ان عادات واطوار کی رو سے اگر انہیں ایک قوم کہا جائے گا تو یہ خود لفظ کے خون ہونے کے مترادف ہوگا۔

اس سلسلہ میں سورہ حجرات کی مشہور و معروف آیت جو عام طور پر قوم پرست بظاہر لیکن حقیقت میں قومیت پرست تحریکیں اور لوگ پیش کرتے ہیں۔ آیت نمبر ۱۳۔

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکرو انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم۔ ان اللہ علیم خبیرا o

(مفہوم): (جن معاشرتی برائیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ان کا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جذبہ انسانی زندگی کے اور گوشوں میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً مردوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ عورتوں سے افضل ہیں۔ یا بعض خاندان نسبی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے معزز تصور کرتے ہیں)۔ ہم نے انسانوں کو مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا کیا ہے (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسانی بچے میں۔۔۔ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔۔ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ عورت کا۔۔ اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ مرد، عورتوں سے افضل ہیں۔ یا عورتیں مردوں سے الگ ہیں)۔ باقی رہے مختلف خاندان یا قبیلے تو اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔ ورنہ، نہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے سے افضل ہے نہ کوئی خاندان کسی دوسرے خاندان سے معزز۔ میزان خداوندی کی رو سے عزت اور تکریم

کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ تم میں سے کس کی زندگی قوانین خداوندی سے زیادہ مطابق ہے۔ کون ان کی زیادہ اطاعت کرتا ہے۔ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یا کسی خاندان یا کسی قبیلے میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں معیار فضیلت حسب ونسب نہیں' ذاتی جوہر اور سیرت و کردار کی بلندی ہے۔ یہ بات وہ خدا کہہ رہا ہے جو اچھی طرح جانتا ہے کہ فضیلت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن' ص ۱۲۰۸)۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک آیت میں قومیت اور قبائلیت کی ایسی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ ہے کیا چیز؟ یعنی قومیت' حسب نسب کی وابستگی' خاندانی تعلق' کسی بھی قبیلے سے منسلک ہونا' وطنیت' علاقائیت' زبان کا تفاخر سب کے سب چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ دوسری کسی نظریئے کی بنیاد پر وابستگی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو قوانین خداوندی پر عمل پیرا ہوں' جو ایک نظریہ ہے' علیحدہ قوم متصور ہوں گے۔ نسلی' قبائلی اور بعض حالات میں خونی قومیتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں مثلاً آج بھی ہندوستان یا دیگر ممالک میں سالہا سال سے پٹھان یا سندھی موجود ہیں۔ صرف ان کو اپنی تاریخ کا حوالہ یاد ہے اور کچھ نہیں۔ اب ان کی قومیتیں بدل گئی ہیں۔ بظاہر وسیع المعانی انداز سے اگر دیکھا جائے تو پاکستان کی تحریک دوقومی نظریئے کی بنیاد پر شروع کی گئی تھی یعنی ایک طرف خالصتاً مسلم قوم تھی جبکہ دوسری طرف کانگریس جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی غرض ان گنت بولیوں' زبانوں' مذہبوں کے لوگ تھے جبکہ مسلم لیگ میں دور دور تک کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا۔ یہ تھا وہ قومی جذبہ محرکہ جس پر پاکستان کی خشت اول رکھی گئی۔ محولہ آیت کے لفظ ''جعلنکم'' پر غور فرماویں۔ مقرر کرنا اور خلقنکم پیدا کرنا میں بڑا فرق ہے۔ (تخلیق آدم کے سلسلے میں عام طور پر یہیں ٹھوکر لگ جاتی ہے)۔ اب اگر مسلم ایک قوم نظریئے کی بنیاد پر موجود ہے تو اس میں چھوٹی چھوٹی قومیتیں یعنی لقوم یومنون' لقوم یتفکرون' لقوم یغلبون' لقوم یعقلون وغیرہ وغیرہ ثم وغیرہ موجود ہوں گی۔ دوسری طرف جو اس نظریئے کے مخالف ہوں گے۔ ان میں لقوم فاسقین' لقوم ظالمین' لقوم خٰسرین وغیرہ وغیرہ ہوں گے۔ پھر اگر انہوں نے اپنی قومیت کو کسی مٹی' جغرافیائی موجودگی' زبان' خون یا نسل سے وابستہ کیا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قبائل ہیں' شعوب ہیں۔ محض پہچان کے لئے انہوں نے ایسا کیا ہے۔ اب آپ غور فرمائیں۔ قومیتیں سینکڑوں ہوں گی۔ (یاد رہے عربی میں عام طور پر قومیت کا لفظ استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ اردو کی مہربانی ہے خاص طور پر

سیاست دانوں کا پیدا کردہ لفظ یا اصطلاح ہے)۔ اب میدان میں وسیع معانی کے اعتبار سے دو بڑی قومیں کھڑی ہوگئیں۔ ایک نظریئے کی بنیاد پر قائم قوم اور دوسری اس نظریئے کے خلاف۔ یہی وہ آیت ہے جسے اب ہم اس طرح پڑھیں گے۔ کہ ھو الذی خلقکم فمنکم کافرو منکم مومن۔ (۶۴/۲)۔ تمہاری تخلیق اللہ نے کی ہے۔ (اس نے تمہیں ایک نظریہ دیا۔ جس نے انکار کیا) کوئی کافر ہوا۔ (یاد رہے ہمارے ہاں کافر گالی کے معنی میں آتا ہے حالانکہ اس کے معنی انکار کرنے کے لئے۔ کوئی بھی شخص جو خود کو مسلمان کہلوائے لیکن قوانین خداوندی سے انکار کرے تو ایک درجہ کفر میں آجاتا ہے۔ اب اگر آپ قاموس کا مطالعہ کریں تو کفر کے معنی To cover to hide بھی ہیں۔ لیکن مذہبی معنوں میں اسے لیا جائے تو کفر باللہ کے معنی To deny God ہیں۔ کفر۔ ہیلمٹ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ سر کو چھپا دیتا ہے) اور دوسری طرف نظریئے کی بنیاد پر کوئی مومن ٹھہرا۔''

یہاں انسان کو مکمل اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو دائیں بازو کی طرف آئے اور چاہے تو بائیں بازو کی طرف جائے۔ نظریئے میں ایک درجہ ''ہاں'' کا ہے (قبولیت) اور دوسرا ''نہیں'' کا انکار۔ بیک وقت دونوں نہیں ہو سکتے۔ یہیں سے قوم کے وہ وسیع معانی شروع ہوتے ہیں جس کا تصور قرآن کریم پیش کرتا ہے اور یہی وہ دوقومی نظریہ ہے۔

قرآن کریم کی نص صریح کی رو سے معیار قومیت (یعنی قوم) کفر اور اسلام کا اختلاف ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ:

ولا تکونوا من المشرکین o من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون o (۳۲۔۳۱/۳۰)۔

''خبردار! مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ (یعنی تمہیں جو نظریہ دیا گیا ہے اس پر قوم کی حیثیت سے محکم۔ برقرار۔ ٹھہرا ہوا رہنا) یعنی اس نظریئے کے ساتھ کسی قسم کی ملاوٹ نہ کرنا اور اگلی آیت میں تو واضح طور پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں تقسیم ہونے کو مختلف الفاظ سے استعمال کر کے مشرکین کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ لوگ جو دین (ایک نظام' ایک نظریہ' ایک سوچ) میں تفریق فرقہ بن کر ڈالتے ہیں اور پھر ہر ایک حزب (قومیت) اپنے آپ پر خوش ہے۔ اس آیت سے قبل فرمایا۔ مفہوم۔ لہٰذا صحیح روش زندگی یہ ہے کہ تو ان تمام غلط راہوں سے منہ موڑ کر اپنی تمام توجہات کو اس نظام زندگی پر مرکوز کر دے جو خدا کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے اور جس قانون کے مطابق اس نے خود انسان کو پیدا کیا ہے۔

(فطرت اللہ التی فطر الناس)۔ خدا کا یہ قانون تخلیق غیر متبدل ہے۔ (اس لئے یہ نظام زندگی جو انسانی معاشرہ کے لئے بذریعہ وحی دیا گیا ہے اسی طرح غیر متبدل ہے۔) یہی وہ نظام زندگی ہے جو نہایت محکم اور تمام نوع انسانی میں صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔''

بار بار اس آیت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظریئے پر قائم نظام کی بات ہو رہی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے کہ نظام ہا کی بنیاد نظریات پر ہوتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں ہمیشہ نظریات کی مرہون منت رہی ہیں۔ اسی طرح جب چھوٹی چھوٹی قومیتیں ڈوبنے لگتی ہیں تو اقوام بھی ڈوب جاتی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور آیت ۲/۱۴۳ پیش خدمت ہے۔ ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم نوع انسان کے اعمال کے نگران رہو اور رسول تمہارے اعمال کا نگران رہے'' امۃً وسطاً لتکونو شھداء علی الناس..... یہاں قوم کی بجائے امت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ ظاہر ہے نوع انسان کے اعمال کی نگرانی ایک امت (یعنی قوم) کرے گی۔ اب جبکہ حضور ﷺ موجود نہیں ہیں تو ان کا دیا ہوا نظریہ موجود ہے۔ نظریئے پر عمل پیرا امت یا قوم ہوگی اور وہی نگران ہوگی۔ (اگرچہ یہ نگرانی کا فریضہ منفی انداز میں آج امریکہ ادا کر رہا ہے۔ بڑی لمبی بحث ہے۔ اشارہ کافی ہے)۔ اب یہ امت نہ ایرانی ہے' نہ تورانی' نہ سندھی ہے' نہ بلوچی' نہ افغان ہے نہ پنجابی۔ اگر ایسی کوئی امت ہے تو بغیر تفریق نسل' وطن' زبان' یا خون کے امت مسلمہ من حیث القوم ہے۔ اسی لئے فرمایا ''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ تم ایک بہترین امت (قوم) ہو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا۔ (۳/۱۰۹)۔

اب ایمان یا نظریئے کے اشتراک کی بنیاد پر جو امت (قوم) وجود میں آتی ہے۔ اس کے لئے کسی مکان یا جغرافیائی حدود کا تعین غلط ہے۔ یہی امت زمان کے اعتبار سے بھی قیود نا آشنا ہوتی ہے۔

محترم بوھیو صاحب کا ایک اور اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ فرماتے ہیں:

''مفسدیں۔ یعنی خطہ اور ریاست و ملک مدین میں فساد نہ پھیلاؤ' علاقے مدین کی زمین میں فساد نہ پھیلاؤ' غور کرنے والوں کے لئے قوم عاد اور قوم ثمود کی مثالوں کے بعد جناب شعیب علیہ السلام کی مثال میں جو تنوع اور تفرد ہے اس پر غور کرنا چاہئے۔ جو اس مثال یعنی وحدت وطن اور علاقے کو اخوت اور قومیت کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہاں مناسب ہوگا کہ قوم لفظ کی اصلی' لغوی' لفظی اور

بنیادی معنی اس کے مادے قوم کے حوالے سے سوچی جائے۔ وہ یہ کہ جو گروہ' جو جماعت' جو افراد' جن جن چیزوں سے قوام حاصل کریں' قوت حاصل کریں' تو وہ گروہ' وہ افراد ان قوت اور قوام دینے والی چیز کے نام کی قوم کہلائیں گے۔ اگر کچھ لوگ ایک نسل' ایک خونی رشتہ اور قبیلہ کے ہیں تو وہ اس نسل کے نام کی قوم کہلائیں گے۔ پھر اس میں نیک و بد اور مختلف افکار و نظریات والے برے بھلے سب ایک نسل سے ہونے کی بنیاد پر ہم قوم ہوں گے اور ایک قوم کہلائیں گے۔ جیسے کہ آپ نے ابھی انبیاء علیہم السلام کی مثالوں میں یہ حقیقت ملاحظہ فرمائی۔ اگرچہ قرآن حکیم کی یہ مثال اس دعویٰ کہ کافر و مسلم ایک قوم سے ہو سکتے ہیں اسے کوئی سرکاری عیسائی دانشور جان برائیٹ جیسا جو خالق ہے نظریہ پاکستان کا وہ مانے یا نہ مانے۔ لیکن قرآن نے صاف صاف وطنی جغرافیائی بنیاد پر قومیت اور نسلی بنیاد پر وحدت قوم کا نظریہ پیش کر دیا ہے۔'' (اس کے بعد اگلا اقتباس زیر بحث آئے گا)۔

بعض اوقات انسان کی حیرانی کی حد نہیں ہوتی جب یہ دیکھے کہ ایک شخص قرآن کا داعی ہے۔ قرآن کی آیات اپنے دفاع میں پیش کرتا ہے اور قوم کی بنیاد خاک' خشت' آب و جبل (جغرافیہ) پر رکھتا ہے۔ ایک نظریہ کو ان چیزوں کے ماتحت کر دیتا ہے۔ ابوجہل بھی قریش تھا اور صحابہ کرام بھی قریش تھے۔ حضورﷺ بھی قریش تھے لیکن نسلی تفاخر اس وقت خاک رسید ہو گیا جب ایک ہی نسل سے وابستہ ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو گئے۔

نوح علیہ السلام کا اپنا بیٹا ایمان نہ لانے کی وجہ سے مورد عتاب ٹھہرا۔ جب نوح علیہ السلام نے انتہائی عاجزی سے آواز دی۔ کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! میرا بیٹا میرے اہل سے تھا اور تیرا وعدہ تھا کہ میرے اہل کو بچا لیا جائے گا اور تیرے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ اور تیرے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں جو تیرے فیصلوں کو بدل دے۔ ان حقائق کے پیش نظر' میرے بیٹے کو تو محفوظ رہنا چاہئے تھا۔ وہ کیوں غرق کر دیا گیا۔ اس پر خدا نے کہا کہ اے نوح! (تو نے اہل کا (یعنی نسل یا خون کے رشتے) صحیح مفہوم نہیں سمجھا وہ بے شک تیرا بیٹا تھا لیکن تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ تیرے اہل میں سے وہی ہو سکتے ہیں جن کے اعمال صالح ہوں اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ (سورہ ھود کی آیت ۴۱ تا ۵۱ غور سے پڑھنے کے بعد قوم کی سطح تک خونی اور نسلی تفاخر کا پتہ لگ جاتا ہے)۔ اسی طرح سورہ اعراف میں ۶۴ آیت انتہائی قابل ملاحظہ ہے جس میں قوم عمین (اندھی قوم) کا ذکر ہے۔ کیا یہ ایک مضحکہ خیز بات نہیں کہ پوری کی پوری قوم اندھی ہو اور قوم کی اصطلاح

اندھوں کے لئے آئی ہو۔

آگے چل کر آپ نے ایک جان برائیٹ کا حوالہ دیا ہے۔ کم از کم ہم نے آج تک نہ کہیں یہ پڑھا ہے اور نہ ہی سنا ہے کہ نظریہ پاکستان کسی انگریز جان برائیٹ کی پیداوار تھی۔ ہمیں تاریخ کا اس حد تک مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ پھر اگر یہی بات ہے تو قائداعظم کا تعلق سندھ سے تھا۔ قومیت کی بنیاد اگر اوطان پر ہو تو بوھیو صاحب کو قائداعظم کا اس حد تک پیروکار رہونا چاہئے تھا۔ البتہ کانگرس کی بنیاد ایک انگریز نے ضرور رکھی تھی اور یہ فسوں کانگرس کے کان میں پھونک دیا گیا تھا کہ قومیت کی بنیاد اوطان پر ہوتی ہے۔

میں ایک بار پھر یاد دلاتا جاؤں کہ میں آج بھی کسی خاص بنیاد پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں اور قبائلوں کا قائل ہوں لیکن جب قوم کی بات آئے گی تو پھر ایک نظریئے کی حامل ہوگی۔

اب ذرا اقوام متحدہ پر نظر ڈالئے۔ اقوام متحدہ کی بنیاد اوطان پر ہے۔ میز پر کئی ممالک کے نمائندے بیٹھتے ہیں اور اپنے اپنے ملک کے مسائل پیش کرتے ہیں۔ فریضہ حج کو بوھیو صاحب نے اقوام متحدہ کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ بالکل درست ہے۔ حج میں کئی قومیتیں آ کر ایک قوم بن جاتی ہیں۔

حضورﷺ مکہ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ مکہ کو فتح کیا۔ لیکن دفن مدینہ میں ہوئے۔ اس سے بڑا ثبوت اوطان پرستی کی نفی میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آگے چل کر آپ نے ڈومیسائیل کا حوالہ دیا ہے۔ شاید کہیں سوئی اٹک گئی ہے۔ ہم بار بار کہتے ہیں کہ قومیت اور قوم میں فرق کریں۔ صوبہ سرحد میں رہنے والوں کا ڈومیسائل صوبہ سرحد کا ہوگا۔ سندھ کا ڈومیسائل سندھ کا ہو گا۔ لیکن شناختی کارڈ پاکستان کا ہوگا اور یہ حق ہم اس وقت تک ہر کسی کو دیں گے جب تک کسی نظریئے کی بنیاد پر کوئی قوم تعمیر نہ ہو۔ ۱۹۴۷ء تک مسلم قوم اور ہندو قوم دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں۔ بعد میں ہم راہ بھول گئے۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام اور ان کے والد کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن نے پیش کیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ایک برگزیدہ نبی اور انبیاء کے مورث کی دعا شرف قبولیت حاصل نہیں کر پاتی۔ خون کا رشتہ، وطن کا رشتہ، علاقائی رشتہ، نسلی اور زبان کا ہوتے ہوئے بھی دعا ناکام ہوئی۔

عام طور پر نظریہ پاکستان پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ہندو سے نفرت کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پاکستان کے ہوتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ سے زائد ہندو موجود تھے۔ آج بھی سندھ میں لاکھوں ہندو موجود ہیں۔ ان کی قومیت سندھ تو ہوسکتی ہے لیکن وہ مسلم قوم کے افراد نہیں ہوسکتے۔

مضمون کافی لمبا ہو چکا ہے۔ ورنہ یہاں ہندوؤں کی ان چار ذاتوں کا بھی ذکر ضروری تھا۔ جس سے آج کے نوجوان بے خبر ہیں۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔ اس کے مقابلے میں حضورﷺ کے آخری خطبہ حجتہ الوداع کے موقعہ پر جب یہ کہہ دیا گیا کہ کسی عرب کو عجم پر اور عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل نہیں تو عرب جو خود کو عرب اور باقی دنیا کو عجم (گونگے) کہتے تھے ایک قوم بن کر ابھرے۔ یہ کیا تھا وہ نظریہ جسے قرآن کریم نے دو قومی نظریہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح پنڈت لچھمن داس نے اگر اسلام قبول کیا تو وہ مسلم قوم میں تصور ہوگا۔

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ایک نسل کے لوگ اگر ایک قوم کے لوگ شمار کئے جاتے ہیں یا ایک قومیت، شعب یا قبیلے کے افراد گنے جاتے ہیں تو اس میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہونا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں آخری حد تک سمجھانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ انما المومنون اخوہ یعنی قوم مومنوں کے لوگ آپس میں بھائی بھائی ہوں گے۔ اب اگر کوئی ہندو شودر بھی مسلمان ہو جائے (مسلمان دراصل مسلم کا فارسی ترجمہ ہے۔ خود لفظ مسلمان قرآن کریم میں نہیں ہے) تو وہ مسلم برادری کا فرد اور مومن قوم میں شمار ہوگا۔

بالکل آخر میں درد اور شکایت بھری آیت کا حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ:

وقال الرسول یارب ان قوم اتخذو هذا لقران مهجورا o

یہ شکایت روزِ محشر صرف اہل مکہ کے متعلق یا اہل قریش کے متعلق نہیں ہوگی بلکہ ہم نے بحیثیت مومن قوم کے جس کتاب کو قبول کیا تھا اور پھر پوری طرح اس قوم میں داخل نہ ہو سکے، کے متعلق شکایت ہوگی کیونکہ مذہبی لیبل کے حساب سے ہم فرقوں میں اور نسلی، گروہی، علاقائی، خونی اور زبان کے اعتبار سے قومیتوں میں تقسیم ہو چکے تھے جبکہ کفر کے زمرے میں آنے والے آج بھی متحد ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل

یومِ مئی

بہت سے ممالک میں یوم مئی کو موسم بہار کی آمد کے تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۱۸۸۹ء میں دنیا کی سوشلسٹ پارٹیوں کی کانگریس کا اجتماع پیرس میں ہوا جس میں امریکا کے مزدوروں کی اس تحریک کی حمایت کی گئی جو آٹھ گھنٹے کام لینے سے متعلق تھی۔ اس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ یکم مئی ۱۸۹۰ء کو امریکا کے مزدوروں کے حق میں مظاہرہ کیا جائے۔ بعد میں اسے مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جانے لگا۔

مزدوروں کے مسائل کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ یہ ایک نہایت وسیع موضوع ہے۔ اس مضمون میں صرف ان اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے جو محنت کشوں کے استحصال کا باعث بنتے ہیں۔ ویسے تو محنت کش کا استحصال اسی دن سے شروع ہوگیا تھا جب اس نے ایک شاطر یا ظالم شخص کے لئے محنت کی۔ اس شاطر نے محنت کش کی محنت سے حاصل ہونے والی رقم میں سے کچھ اسے دے کر باقی اپنے پاس رکھ لی۔ اس کے بعد ایک انسان کا دوسرے انسانوں کو محکوم بنانے کا جو عمل شروع ہوا ہے وہ آج تک ختم نہیں ہو سکا۔ (سوائے اس دور کے جس میں اللہ کا نظام نافذ العمل رہا)۔ دور اول کا وحشی انسان ہو یا مہذب دنیا کا سرمایہ دار، ہر دور میں نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے جن کے ذریعے انسانوں کو محکوم بنا کر ان کی محنت کا ماحصل ان لوگوں کی جیبوں میں جاتا رہا جو خود محنت نہیں کرتے۔ علم سے محروم کسی محنت کش کے ذہن میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کی محنت کا پھل کھانے والوں میں کس کس کا حصہ ہے۔ وہ اپنے سیٹھ، وڈیرے یا مل مالک سے معاوضہ بڑھانے یا کچھ سہولتیں مہیا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ جس سے وہ اپنے لئے چند سکوں کی بھیک مانگ رہا ہے وہ اسی کی محنت کا ثمر لوٹ کر کھا رہا ہے۔

نوع انسانی کو محکومی کے شکنجے میں جکڑنے والی طاقتیں تین ہیں۔ سب سے پہلی ہے سیاسی، چاہے یہ بادشاہت ہو، ڈکٹیٹرشپ یا جمہوریت۔ یہ سب کبھی بزور

طاقت یا کبھی عوام کو ورغلا کر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بادشاہت یا ڈکٹیٹر شپ میں ایک فرد یا خاندان حکومت کرتا ہے اور جمہوریت میں ایک گروہ۔ یہ عوام کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں لڑانے میں مصروف رکھتے ہیں اور خود ملکی دولت لوٹنے میں مگن رہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام مسلسل ان سے دھوکہ کھا رہے ہیں جو اپنا پیٹ بھر کر بھوکوں سے ہمدردی کرتے ہیں' اپنی جاگیروں کو وسعت دینے والے کسانوں کے لئے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں یا جدہ' دوبئ اور لندن میں عیش کرتے ہوئے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کے دکھوں میں برابر کے شریک ہیں' حالانکہ عوام کے مصائب کا سبب یہ لوگ خود ہیں۔

دوسری طاقت سرمایہ دار کی ہے جو مزدوروں کی محنت سے دولت جمع کرتا ہے اور ان کو چند سکوں پر ٹرخا دیتا ہے۔ یہ دوسروں کی محنت پر نہ صرف پھلتے پھولتے ہیں بلکہ دولت کے انبار لگاتے ہیں۔ یہ نہ تو محنت کشوں کو بھوکا رکھتے ہیں کہ کہیں وہ خونی انقلاب نہ لے آئیں اور نہ ہی انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے ہیں۔ ایسی ذہنیت کے حامل لوگوں کی عکاسی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہی کی نوید سنائی ہے۔ ارشاد باری ہے:

(1)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (۱) اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۳))

عام طور پر اس کے ترجمے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ترازو میں ڈنڈی مارنے والوں کے بارے میں ہے جو خود لیتے وقت تو پورا وزن کرتے ہیں لیکن دوسروں کو دیتے وقت کم تولتے ہیں۔ درحقیقت یہ آیات ایک سرمایہ دار کا طریقہ واردات بیان کر رہی ہیں کہ وہ معاوضہ دینے میں ڈنڈی مارتے ہیں' لوگوں کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے اور ہمیشہ ان سے اپنے مفاد کے مطابق کام لیتے ہیں۔ یہ اقلیت معاشرے کی میزان میں اپنے پلڑے کو ہمیشہ جھکائے رکھتی ہے اور عوام کی اکثریت عدم توازن کا شکار رہتی ہے۔

تیسری طاقت کی طرف تو لوگوں کی توجہ شاید جاتی ہی نہیں۔ پہلی دو طاقتوں کا آپس میں گٹھ جوڑ تو نظر آتا ہے لیکن عام طور پر نہ اس طبقے کو نہ تو طاقت سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا دوسری دونوں طاقتوں سے کوئی تعلق نظر آتا ہے۔ یہ طاقت مذہبی رہنماؤں کی ہے جو ایک ایسے دشمن کی طرح ہیں جو دوست کے روپ میں ہو۔ لوگ ان کے ہاتھ چوم رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی محرومیت میں ان حضرات کا بھی حصہ ہے۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے تقدس میں ہے۔ اگر آپ بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو چند لمحوں کے لئے تقدس کا پردہ ہٹا کر غور کریں کہ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ان کے پاس دولت

کہاں سے آتی ہے؟ ان کا طرز زندگی امیرانہ کیوں ہے؟

دوسری دونوں طاقتوں سے ان کا تعلق اس طرح بنتا ہے کہ یہ انہیں عوام کے غیض وغضب سے بچائے رکھتے ہیں۔ یہ عوام کے ذہنوں میں ایسے عقائد بھر دیتے ہیں کہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہیں کون کون لوٹ رہا ہے اور اس کا طریقہ کار کیا ہے۔ مذہبی پیشوا تھکن سے چُور مزدور اور سورج کی تپش میں جلنے والے دہقان کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ ان کی مشکلات کا اصل سبب سیاسی رہنما' سرمایہ دار اور یہ حضرات خود ہیں۔ وہ انہیں تقدیر کی لوری دے کر سلاتے رہتے ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ تو ایک راز کی بات بتا رہے ہیں:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

یہ تو ابلیس کی آواز ہے اور تقدیر کا سبق بھی اسی نے سکھایا ہے۔ لہٰذا جو بھی لکھی ہوئی تقدیر کا فلسفہ سمجھا رہا ہو وہ ابلیس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اب ذرا ان آوازوں کو بھی سنئے۔ ''اللہ جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے''۔ ''غربت اور امارت تقدیر میں لکھ دی جاتی ہے''۔ یہ ان آوازوں کا اثر ہے کہ جب سارے دن کی مشقت سے ایک کسان کی ہڈیاں چیخ رہی ہوتی ہیں تو وہ کہہ کیا رہا ہوتا ہے۔ ''یا اللہ تو نے میری قسمت میں کیا لکھ دیا ہے؟''۔ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ اپنے مصائب ومشکلات کے لئے اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس کا خون نچوڑتے ہیں انہیں برا نہیں کہتا بلکہ اگر ان کی طرف سے بچے کھچے ٹکڑے بھی مل جائیں تو وہ ان کا شکر گزار ہوتا ہے۔ یہ ٹکڑے اس کی تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے نہیں بلکہ زمیندار نے لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو رزق کریم کا وعدہ کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک یہ ابلیسی تصور تقدیر محنت کشوں کے ذہنوں سے نہیں نکلے گا انہیں اللہ کا نظام سمجھ میں نہیں آئے گا۔ پہلے انہیں '' لا '' کہنا ہوگا ہر اس تصور کو جو غیر قرآنی ہے اور پھر 'الا اللہ' کی طرف بھی آنا ہوگا۔

(2)

اللہ تعالیٰ کا نظام جاننا چاہتے ہیں تو براہ راست قرآن کریم سے معلوم کریں۔ سنت نبوی ﷺ معلوم کرنی ہو تب بھی قرآن کریم ہی میں تلاش کریں۔ یہ ضروری نہیں کہ منبروں سے آنے والی صدائیں قرآن کریم کی آواز ہوں۔ جن طاقتوں کا ذکر پہلے آیا ہے ان کے بارے میں قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ فرعون' قارون اور ہامان کے نمائندہ ہیں۔ جب تک عوام ان تینوں کے چنگل سے نہیں نکلیں گے ان کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے رزق کے تمام وسائل پیدا کئے ہیں۔ سورج' ہوا' پانی اور زمین اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی منفعت کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے دو پر تو انسانوں نے قبضہ کر لیا ہوا ہے' باقی دو ابھی ان کی دسترس

میں نہیں آئے۔ زمین پر پہلی مرتبہ جو قبضہ کیا گیا وہ طاقت کے زور پر تھا۔ وہ زمین جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیدا کی تھی اس پر چند لوگ قابض ہو گئے اور بعد میں اس قبضے کو انسانی شریعت نے سند عطا کر دی۔ پانی کی قلت کا مسئلہ پیدا ہوا تو طاقتور زمینداروں نے اپنی مقبوضہ زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی کا رخ بھی موڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کے پیدا کردہ ذرائع رزق پر قابض ہو جائے۔ اس نے کہا ہے کہ ''الأَرْضُ لِلّٰہِ'' (زمین اللہ کی ہے) یعنی یہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اپنی نظم کا عنوان بناتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کس خوبصورتی سے واضح کیا ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہِ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں تیری نہیں تیری نہیں

انسان صرف محنت کرتا ہے باقی سب کچھ اللہ کا نظام کرتا ہے۔ جب فصل پک کر تیار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کا حق ادا کر دو (۶:۱۴۲) یہ حق وہ اپنے بندوں کے لئے مانگتا ہے۔ خود تو وہ بے نیاز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سامان رزق پر تمام انسانوں کا حق ہے اسے اس طرح تقسیم کرو کہ کوئی اس سے محروم نہ رہ جائے۔ اس طرح وہ ہر انسان کو رزق کریم عطا کرتا ہے جس سے کوئی انسان ذلت محسوس نہ کرے۔ اگر آج کوئی بے حد امیر ہے اور کوئی بے حد غریب تو یہ محض اس لئے ہے کہ دولت کی تقسیم کے لئے اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع پیداوار پر قابض لوگ اسے اپنی خواہش کے مطابق استعمال میں لا رہے ہیں۔ غربت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جو دوسروں کو محروم رکھ کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رزق تقسیم نہیں ہوگا یہ ناہمواریاں برقرار رہیں گی' ایک دوسرے کا استحصال جاری رہے گا' لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی' یہ طاغوتی نظام پھلتا پھولتا رہے گا اور منبروں سے اسے اللہ کا لکھا کہہ کر پیش کیا جاتا رہے گا۔ اس طرح محنت کشوں کے حالات نہیں بدلیں گے۔

بہتری کا عمل نظریات کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر محنت کش اپنے حالات بہتر اور مستقبل خوش آئند بنانا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے دشمنوں کی پہچان کرنا ہوگی اور ان کے فریب سے نکلنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے تجویز کردہ نظام زندگی کو اپناتے ہوئے اسے دوسروں تک پہنچائیں تاکہ ایک کارواں بن جائے جو وقت کے ساتھ ساتھ سیل رواں بن جائے جو ہر فرعون' قارون اور ہامان کو غرق کر دے۔

What happened to Islam after Umar?

Rank hatred has already appeared from their mouths:
What their hearts conceal is far worse. (3/118)

(While going through the January 2006 issue of Tolu-e-Islam I came across a review of the Late Shorish Kashmiri, Editor of the weekly Chattan-Lahore, on the well-known book of Mr. Ghulam Ahmed Parwez, "Shah Kar-e-Risalat - the biography of Caliph Hazrat Umar Farooq".

This article reviews only the last chapter (Chapter 14) of "Shah Kar-e-Risalat" that actually sums up, in 94 pages, the 1400 years' history of the infiltration of the Non-Arab (Ajami) or non-Islamic ideas into Islam.

In his article, written in May 1974, Mr. Shorish Kashmiri provides a deep and thought provoking glance of the deliberations of Allama Mohammad Iqbal and Mr. Ghulam Ahmed Parwez to expose creeping of non-Islamic ideas and beliefs which are now being practiced as true Islam.

After reading this review I decided to read the whole chapter. It was so interesting and illuminating that I was glued to the book and completed its reading in one sitting. Then I thought it appropriate to share this knowledge with the people who don't know Urdu and embarked on translation of the chapter into English which is widely read and spoken.

It is very difficult to translate material from one language to another language because every language has its unique expressions, idioms, terminology and tone. That is why it is sometimes said that one language cannot be translated perfectly into another language. And when it comes to religious subjects it becomes more difficult.

In my translation, I tried my best to stick to the text but sometimes I was forced to digress a little in a bid to explain and clarify a concept. At several places, I have also used Arabic terminology for which I could not find any appropriate or equivalent English word.

At the end I have given glossary of Arabic words and religious terminology which have been used in the translation. I hope that the glossary will help in clarifying the meanings.

Abdus Sattar Ghazali,
Modesto, California,
March 1, 2006

Recall the dialogue between Hazrat Umar and the defeated Governor of Iran, Harmazan who was presented to the Caliph. Hazrat Umar asked Harmazan, what is the reason that in the past whenever Arabs dared to attack you, you repelled them very easily? But now the same Arabs are vanquishing your empire and you are helpless. You are in front of me in a devastated condition and your emperor is running to save his life.

Harmazan replied that it is very obvious that in the past wars, Iranians were on the one side and the Arabs on the other. It was not difficult for Iranians to defeat the Arabs. But in the present wars, Iranians are alone while Arabs and their God are on the other side. It is not possible for us to confront these two powers, that is the reason that we were defeated.

Secret of the Muslim power

This was a blunt reality that was described by Harmazan in a few words. We should admire the wisdom of those people who very clearly visualized the distinguished feature of Islam and in this way found the secret of the power of Muslims.

What Harmazan said was actually a reflection of this Quranic verses:

Varily Allah is with the believers. (8/19)

Helping the believers is every incumbent on us. (30/47)

Iranians realized that as long as God is on the side of the Muslims, we or any other world power would not be able to subjugate them. Therefore it is imperative that they should be separated from God in order to take revenge. And after that all our history is the detail of how we were delinked from God. It is very obvious that God does not descend on the earth to help the Muslims. The meaning of "with God" was that the Muslims of that era spent their lives in accordance with the Book of God, which resulted in the establishment of Deen.

A tangible proof of God's promise was:

Allah by no means give the unbelievers a way against the believers. (4/141)

Muslims alienated from the Quran

Defeated nations conspired against the Muslims so that they should be alienated from the book of God (the Quran). Allama Iqbal calls this a non-Arab (ajami) conspiracy.

It may be pointed out that when Iqbal talks about Arabic Islam in comparison to Ajami Islam, he does not mean Arab and Iranian states or territories. By Arabic Islam he means that the Islam that was given to humanity by the God Almighty through Prophet Mohammad (PBUH) and which is now preserved in the Quran. By Ajami Islam, Allama means the prevalent Islam that has been distorted. Iqbal refers to the first one as Arabic Islam because Quran's first invitees were Arabs and it was revealed in their language.

He refers the other one as Ajami because it was Iran where the distortion of Islam began. Now it is a mixture of non-Quranic ideas and beliefs which are mainly based on the ancient Iranian religion (Magian/Zoroastrian) and civilization.

Difference between the victories against Iranians and Romans

Muslims defeated the Iranian and Roman empires during the Caliphate era but there was a basic difference in the two victories. Only part of the Roman empire was occupied by the Muslims but the whole empire was not disintegrated nor their civilization vanished. On the other hand Iranian empire was occupied and their centuries old civilization, on which they were proud, vanished.

Therefore, Muslim victories caused a deep wound on the psyche of Iranians. Consequently, they were in forefront in conspiracies against the Muslims (rather Islam). Jews and Christians supported them. Their endeavor was to conceal the real meaning of Quran from the Muslims. No doubt they were very much successful in their effort.

There was another difference between Iran and Rome. As we have seen earlier, Muslims captured their territory but their residents were given full religious freedom. No one was converted to Islam by force because it was against the teaching of the Quran. The Christian citizens of the Roman empire generally followed their own religion while the Iranian citizens generally embraced Islam. Most of them accepted Islam at the time of attacks by the Muslim armies.

Iranians embrace Islam

There were intellectuals and army officers among the Iranian population that embraced Islam. For example, Emperor Yazdgar had prepared a 4000-man special unit from the tribe of Wailem that was called the Soldiers of the Emperor. After the victory of Qadsiyya, this united separated from the Iranians and embraced Islam. Saad Ibn Abi Waqas gave this unit permission to settle in Kufa.

Similarly, the commander of the infantry of Yazdigard was a very prominent officer, known as Siah. When Yazdigard left Isfahan, he sent Siah with a special unit to confront the Muslims. However, instead of fighting with Muslims, he embraced Islam along with his unit. They were all settled in Basra.

Bazan was Nosherwan's Governor in Yemen. Most of the army under his command accepted Islam.

Asawra

As we mentioned earlier, the personal unit of Emperor Yazdigard embraced Islam. These people were not only soldiers but, like the Nine Advisors (*Noratan*) of Akbar, were special advisors to the Shahinsha and used to be called Asawra. The biggest symbol of honor and nearness to the Emperor was the golden bangle. Those who were given this symbol used to be called the Asawra people. Bangle is called asura. It is said about the people of paradise that they will be wearing golden bangles (18/21), which means higher degree of honor.

After the Muslim victories these people became Muslims in large numbers. We do not want to say or should say that all these people came to the fold of Islam with mal intentions. However as we will come to know later, the intellectuals among these people entered into the Muslim umma with malign objectives, so that they could introduce ancient Zoroastrian ideas and customs. As a matter of fact, the simple Arab people were no match for the complicated Iranian thoughts and their clever political maneuvers.

Therefore, in this sphere, they were defeated easily. However, the Iranians who embraced Islam with sincerity were no different than the Arab Bedouin Muslims about whom the Quran says:

The desert Arabs say, "We believe." Say, "Ye have no faith; but ye (only)say. (49/14)

Hazrat Umar was aware of this situation. Therefore, he wanted to give proper education and training to the neo-Muslims in order to bring an inner change in them and sink the Islamic belief in their hearts. But the conspiracy of Harmazan was successful before Hazrat Umar was able to implement his program. He realized that the biggest obstacle in taking revenge from the Muslims is the personality of Hazrat Umar. Iranians will not be successful in their objectives unless he is removed. The path was clear once this obstacle was removed. Neo-Muslims could not be educated and trained while it was easy for the shrewd Iranians to infiltrate their thoughts among them.

We see two fronts of non-Arab conspiracies to achieve their objectives. One front was aimed at weakening of the Muslim empire and gain political dominance. The other front was aimed at to imprint Islam with the non-Arab ideas and beliefs. If we analyze deeply, we find that their main objective was not to gain political dominance rather their political clout was used to achieve the second objective.

This is a valley where even angels do not dare to enter

However this is a very delicate question. The reason is that there is no aspect of our present Islam which is not affected by the Ajami conspiracy and entrapped in non-Islamic ideas. This Islam may be of the followers of *Shariat* of any school of thought or the follower of *Tariqat*, it has a deep imprint of the Ajami (un-Islamic) ideas.

It is obvious that when someone says that our present Islam is corrupted with un-Islamic beliefs and thoughts, our religious leaders abhor this and insist that the Islam which they practice is the true Islam.

Hence it looks strange and shocking when someone says that the present belief or school of thought is clearly against the Quranic text.

Books of traditions and History

This argument may not be understood and some people may be shocked, but this is a reality. The reason is that for them authority in Deen are traditions and history. Only that meaning of Quran is accepted that is supported by traditions and history. In other words these religious leaders have subordinated the Quran to the traditions and history rather than subordinating the traditions and history to the Quran.

We will discuss this in detail later. You may be astonished to know that the collections of traditions and history books were all complied by Iranians (not Arabs).

Sunnis consider six of these tradition collections as authentic. These are called *Saha Sitta* (The six authentic one). Shias have four such books of traditions. However, the collectors of all these authentic collections of traditions (Ahadith) whether of Sunnis or Shias, were all Iranians.

Similarly, the first history book, which is considered authentic, was written by Imam Tabri, who was also an Iranian. The first book of Exposition of Quran was also written by Imam Tabri. Remember, all these books were compiled without any written record in the 3rd and 4th Hijra year.

It is very obvious that how much authentic these books could be after the passing away of the Prophet (PBUH).

Taqqiya

There is another problem with the Shia books of traditions and history. *Taqiyya* or hiding their belief is one of their foundation of Deen. What is Taqiyya and what is its place in Islam? To explain this, we will refer to their most authentic book of traditions, Usul-e-kafi.

1. Hazrat Abu Jaffar said that while dealing with your opponents be friendly in public but remain their opponent secretly.

2. Hazrat Abu Abdullah said it is not enough that Imamat is recognized and accepted but our beliefs should be kept secret from our opponents, who should not be told about our traditions. Only our friends should be told about our faith and pray for God's mercy for those who shows friendliness to our opponents in the state of Taqiyya.

Addressing Sulaiman, he said, you belong to that Deen where God will honor you if do not reveal it and you will be dishonored if you reveal it.

This is the importance to Taqiyya.

Hazrat Abu Abdullah said that Taqiyya is the Deen of mine and my ancestors. Who does not practice Taqiyya, is not in the fold of Deen. *(Urdu translation of Syyed Zafar Hassan, Vol II Page 240-247)*

Imams followed this practically. According to Kafi:

I heared Abu Abdullah as saying that "whoever knows that whatever we say is right (correct) so he should trust us for whatever we say. If he hears something that is against the command of God

so he should understand that we had said that to prevent any harm from our enemies. In other word he said that by way of Taqiyya. *(Al Shafi – Vol I, Page 72-73)*

According to another tradition, Imam Jaafar Sadiq asked a Shia that if one year I tell you a tradition and the next year I relate another tradition that is contrary to the first one, so which one you are going to follow? He said the last one. Imam said that God may have mercy on you. (This means that the first tradition was told because of Taqiyya.) *(Al Shafi – Vol I, Page 73)*

Surely, it is difficult or impossible to know the reality from the books of traditions and history compiled by these people.

The Age of Hazrat Aisha

This is the veracity of our (Shia and Sunni) traditions and history compilations which are not only considered sacred but their logical criticism is considered kufr. It is generally accepted that Hazrat Aisha was only six years old at the time of marriage. This assertion is contrary to the clear instructions of the Quran that puberty is a condition of *nikah* (marriage). On the other hand this assertion provided opportunity to the Orientalists to criticize the personality of the Prophet.

After a long and extensive research, this scribe has proved that Hazrat Aisha's age was between 17 and 18 years at the time of her marriage. These people should have thanked God Almighty that this research helped clear the misunderstanding and removed the black spot on the personality of the Prophet caused by the Orientalists because of wrong traditions.

However, as you may know what was the reaction of these people? They argued that in this way we have to accept that the tradition of Bukhari is wrong which is kufr (infidelity). Therefore, this person is the rejectionist of traditions. Hence, 1000 ulamas issued a fatwa of kufr against me.

This is the extent of sacredness of these books which is perpetuated through declaring infidel anybody who challenges their authenticity. This is also the result of the Ajami conspiracy.

In this situation, you can well imagine, that when we declared these historic episodes and traditions as fabrication how our traditionalist ulamas (religious leaders) can agree.

My Maslak or belief

I have explained my point of view about the traditions and history in the introduction of the book. Here I will repeat briefly:

1. Authority in Deen comes from the book of God – the Quran – which explains itself. Our books of traditions and interpretations which are in accordance with the Quranic teachings should be accepted while those books which contradict the Quranic teachings should be rejected.

2. We believe in the prophet-hood of Mohammad (PBUH) and the Quran gives testimony to the righteousness of all (companions of the prophet) *Sahabas*. Therefore, we do not find authentic those books of traditions and history which contain such material that brings a bad name to our prophet's personality or which are against some prominent *Sahabas.*

This is my belief. Regarding the prominent religious elders, of any sect, who came after *Sahabas* and command great reverence, my point of view is that if anything is attributed to them that goes against the Quran, it is attributed to them wrongly. If they were the really the elders of Deen then they would have not said that. But if someone insists that this attribution was correct then the following Quran verse is sufficient for my guidance:

That was a people that hath passed away. They shall reap the fruit of what they did, and ye of what ye do! Of their merits there is no question in your case. 2/141

In the forthcoming pages whatever will be discussed, my belief is that all matters which are contrary to the message of Quran, they are wrongly attributed to those elders.

I am neither Shia nor Sunni or follower of any schoold of thought or Ahle Hadith. I am a simple Muslim. I firmly believe that the Quran is God's last, complete and immutable book and consider Prophet Mohammad (PBUH) as the last and final Prophet of God. Prophet-hood ended with him.

I analyze history and traditions in the light of the Quran. Whatever I have written in the following pages, it is to show how Ajami conspiracies clearly detached Muslims from the Quran and distorted Islam. My effort is to argue with the authority of history and tradition. If somebody dislikes that, its responsibility does not lie with me but with history and tradition. However, I will apologize them because I don't want to hurt any body's feelings.

I would like to clarify another point. As I said earlier, distortion in Islam began in Iran. All un-Islamic ideas and beliefs in Islam were borrowed from the ancient Iranian religion – Zertoshta – By this I do not mean that we hold the present Iranians responsible for that but the Iranians of ancient time. Therefore if (according to history) they are blamed for anything their successors or the present Iranians are not responsible for that. Hence, whatever will be said about Iran, we will mean the ancient Iranians.

The issue of Khilafat (Caliphate)

It was the issue of Khilafat that split the Muslim umma (nation). In the beginning it was a political issue but later it twisted into a religious issue. In this way this united umma split into two permanent religious sects (Sunni and Shia) and it became impossible to bring them together. In chapter III (related to Khilafat) we have seen that Khilafa is elected with the consultation of umma, however, when Hazrat Abu Bakar was chosen in this way, Hazrat Ali objected by saying that he is the heir of Prophet's inheritance that includes khilafat. Therefore khilafat is his inherent right and nobody can take that. For sometimes he struggled to pursue his claim but after the passing away of Hazrat Fatima he became silent. During the reign of Hazrat Umar Farooq he remained silent but during the reign of Hazrat Usman the conflict over khilafat became so intense and divisive that it could never be resolved.

The Right of Inheritance

In his history, Ibn-e-Jarir Tabri, has given detail of Hazrat Usman's election. Without going into details, we will quote briefly: When Hazrat Usman was elected, Hazrat Ali left by turning his face. But he turned back when Hazrat Abdul Rehman Ben Auf stopped him. He pledged allegiance at the hand of Hazrat Usman but he was murmuring that this is a fraud…a big fraud. *(Tabri – Vol III)*

Nahjatul Blagha (compring the sermons and saying of Hazrat Ali) is considered a very authentic Shia book that includes one sermon of Hazrat Ali, entitled *Shaqshaqia,* in which he says that after the demise of the Prophet the three khalifas usurped his right of khilafat which he got in inheritance. *(Nahjatul Blagha – P-136-37)*

However there was a flaw in the claim of khilafat through inheritance because of which it could not be promoted further (as we will see later). Bani Abbas claimed that on the basis of the traditional inheritance, they have the right on khilafat and not Hazrat Ali or his sons. Their argument was that in the presence of uncle, according to Shariat, the inheritance goes to uncle and not uncle's descendents. At the time of the when the Prophet passed away, Hazrat Abbas was alive, therefore, his inheritance goes to him and not to prophet's cousin, Ali. This claim of Bani

Abbas took the shape of family or political controversy. It later twisted into religious controversy because of other reasons. In order to find that reason we need to understand its background.

Iranian's belief about their emperors

Iranians believed that their emperors are not ordinary human beings but are above human beings with Godly traits and authority. They are not elected by the people but appointed by God to rule. Hence only they have the right to rule and nobody could snatch their right which is transferred to their descendents through inheritance. They are God's shadow and his representative on the earth. They do not commit any mistake, therefore, it is incumbent on people to obey their order. These beliefs were on their climax during the period of Sasani emperors when the Quran was revealed that swept away all these beliefs.

Abdullah Ben Sabah

A strange personality, known as Abdullah Ben Sabah, appears on the scene during the reign of Hazrat Usman. His alias was Ibn-e-Soda. Some historians declare him as a concocted personality (for example Dr. Taha Hussain of Egype – Al Fitna Al Kubra in Hazrat Usman's reign). But those who believe that he was a real person say that he was a Jew from Yemen who embraced Islam in Madina, where he stayed for a while and learned the art of statecraft. He then moved to Kufa and made it the first center of his conspiracies. According to some historical histories, he spent some time in Madayen (Iran). Later he went to Egypt from where he spread the network of his conspiracy that was aimed at forcing Hazrat Usman to quit khilafat in favor of Hazrat Ali.

In 35 AH an armed unit comprising the residents of Egypt, Basra and Kufa arrived in Madina and laid siege to the house of Hazrat Usman, martyred the Khalifa and announced the khilafat of Hazrat Ali.

After the martyrdom of Hazrat Usman (as historians report) when there was armed confrontation between Hazrat Ali and Hazrat Aisha (Jamal War), Abdullah Ben Sabah was present in the army of Hazrat Ali. It was his party that attacked the army of Hazrat Aisha when they saw the possibility of a conciliation and thus escalated the conflict.

Later on in the battle of Saffain between Hazrat Ali and Hazrat Muawiyya, the same party was busy in conspiracies on the side of Hazrat Ali.

This was the political role of Abdullah Ben Sabah. However, his conspiracy that caused an un-repairable damage to Islam are his ideologies which he spread extensively.

The belief in "Return" *rajat*

He first said that I am astonished at the simplicity of Muslims that they believe that Hazrat Essa (Christ) will return to earth again but do not believe that Prophet Mohammad will return. The prophet will defiantly come back, he said. This belief could not become popular among the Muslims but spread among the Shias about the sons of their Imam.

History tell us that later on he said that every prophet has a khalifa and heir. Hazrat Ali was the heir of the Prophet. According to the clear instructions of the prophet, Hazrat Ali should have been the Khalifa. The people who prevented Ali from becoming khalifa, usuped his right. Now the Muslims should depose or assassinate Hazrat Usman and Hazrat Ali should be appointed khalifa in his place. This is the only way that the Muslims can mend their mistake and repent for their sins.

The effect of the concept of "God appointed" Imam

The result of the propagation of these ideas was that the Muslims began to adopt the same ideas regarding khilafat that were attributed to the Iranian emperors. According to these ideas, khilafat (this term was letter replaced with Imamat that was more comprehensive and all embracing than khilafat) is not that kind of office that God leaves for the human intellect and can be determined by the decision of the umma. This is an essential pillar of Deen and a basis of Islam. It is not appropriate for the prophet that he should leave this matter undecided at the mercy of the umma. Therefore, it is essential that he should appoint an Imam for the umma. Hence the prophet, at the order of God, leaves a will. For the imamat of Hazrat Ali, the prophet had willed, that is why (Hazrat Ali) is called heir of the prophet. Similarly every Imam leaves a will in favor of his successor Imam. The Imam is appointed by God because this will is in accordance with the order of God. Imam does not commit any mistake, that is why he called "Imam the pious." Therefore if anybody becomes successor of the prophet he is a ususper. It was also said that the right of Imamat belongs to Hazrat Ali and his descendents.

Demarcation line between Kufr and Eemaan (non-belief and belief)

Obviously, this idea about khilafat was against the belief of Sunnis and (for the first time) created two sects in the umma which remained in constant conflict. Later on, the idea of the God appointed Imam was declared an essential part of the faith and became a demarcation line between non-belief and belief (Kufr and Eemaan).

According to this belief, Shia and Sunni are not the two sects of Muslims but (as the Shia's believe) the non-Shias who do not believe in Imamat are outside the fold of Islam. Hence, Shias do not consider Sunnis as Muslims. Later on, Shias split into several sects like the Sunnis. However, all Shia sects have the same view as far as khilafat is concerned. Detail of this issue will be given later when it will be shown that the Shia's claim that these beliefs are on the basis of the knowledge that was given to the Imams by God.

According to history, the ideas which were planted by Abdullah Ben Sabah grew in this shape. As we mentioned earlier, this person was from Yemen which was under Iranian control at that time. Many Iranians were living in Yemen, therefore the roots of the ideas of Sabah were Iranian ideas and beliefs. Later on he spent more of his life in Kufa and Basra where Iranians were settled after embracing Islam. He also lived in Madayen, which was the capital of the Iranian empire. All this indicates that his ideas were a reflection of the Iranians beliefs and customs.

In his book, Egyptian scholar Husnain Haikal has reproduced a long passage from History of the Historian from the Encyclopedia Britannica, that indicates that when the Iranians embraced Islam it affected their politics and religion deeply.

"Iranian belief declared their king as the son of God. He was considered a God of greatness and reverence by birth. Therefore when Iranians revolted against the governments of Madina and Damascus, they gathered around Hazrat Ali, the cousin and legal heir of the prophet, who was kept away from the khilafat. An aura of reverence was created around his personality just as their ancestors used to do for their emperors. Their ancestors called their emperor the son of God and sacred king while their books referred them as Syed and Murshid. Similarly during their Islamic period they gave the tile of Imam to Hazrat Ali. This title has significant meaning despite its simplicity.

When Hazrat Ali was martyred, the Iranians gathered around his two sons (Hassan and Hussain) and later around their descendents. It is said that Hazrat Hussain had married the daughter of the

last ruler of Akasra bani Sasaan. Hence along with the sacred right of Imamat, this marriage created a family link. Later on the blood of Hazrat Hussain in Karbala gave reverence to this unity that was established between Islam and ancient Iran.

It was the Iranian rebellion that snatched the government from Bani Umayya and gave to the relatives of the prophet, Bani Abbas. In this way they implemented and authenticated the principle of Imamat, though they were unable to crown this house for which they exerted all their efforts. *(Umar Farooq-e-Azam by Hasnain Haikal, Urdu translation – P-419)*

Shia traditions regarding Shehrbano

In chapter six, we mentioned about the marriage of Yazdigard's daughter to Imam Hussain. In this respect a tradition in Ahadith book – Usul-e-Kafi – is worth consideration. Within the context of the birth of Ali Ben Hussain, it is said that his mother's name was Salama (More famous as Shahar Bano) Bint Yazdigard ben Shahryar ben Sheroya ben Kasra.

Imam Baqer said that when the daughter of Yazdigard came to Hazrat Umar all bachelor girls of Madina climbed to their roof tops to have a glimpse of her beauty. When she entered the mosque, it became bright (with her presence). When Umar saw her, he veiled his face. She said curse on Hurmuz that I had to see this bad day. Hazrat Umar said that are you abusing me (because I saw you and you call this a bad day)…. *Amirul Momenin* said that she should be given permission to choose anyone from the Muslims and should be considered as war booty. Then she walked through people and put her hand on the head of Imam Hussain. *Amirul Momenin* asked, what is your name? She said Jahan Shah. Hazrat Umar said no, Sheherbano. And then he told Imam Hussain that Abu Abullah you will have a son from her womb who will be the best in the world. Hence Ali Ibne Hussain was born, who was the best Arab because he was Hashmi and the best Ajam because he was Iranian. *(Kital us Shafi – Vol I P-578-79)*

Salman Farsi

Hazrat Salman Farsi is another personality becaue of whom (according to the historical traditions) Hazrat Ali had contacts with Iranians. In his book, Asad Al Ghaba Fi Seerat As Sahaba, Ibne Aseer writes that Hazrat Salman was one of the companions of the prophet. There is a controversy about his age. It is said that his age was between 250 and 600 year. He had seen the era of the disciples of Hazrat Esaa Masih (Christ) and was in the company of those companions. He was aware of the prediction of Hazrat Masih about the appearance of Ahmed (Farqalit) who will emerge in Yathrab.

Salman Farsi was captured and enslaved by a Jew who was coming to Yathrab on a trade mission. In this way he reached there with the Jew. After (hijrat) the migration of the prophet to Yathrab he embraced Islam at his hands. The prophet secured his freed with the financial help of his companions. When the prophet established brotherhood between the refugees (muhajreen) and local residents (ansars) in Medina, Hazrat Salman could not be categorized in any of the two. On this the prophet said that Salman is from my household. *(Refer Izalat Al Khilafa by Shah Walihullah)*

In this way Hazarat Salman Farsi was considers part of "ahle bait" (from the house of the prophet.) When this verse of Sura Juma was revealed:

And others from among them who have not yet joined them (62/3)

Companions asked who are meant by the people who will come later. Hazrat Salman Farsi was sitting next to the Prophet who touched his shoulder or head and said that those people will be

from his nation. And one person of great majesty will be born in this nation who will the capable to find the truth even if it was in stars.

Similarly, it is mentioned in Tirmizi that when this verse was revealed:

If ye turn back (from the Path), He will substitute in your stead another people (47/38)

People asked the prophet which nation Allah will choose instead of us? He touched Salman's shoulder and said his nation, his nation.

These traditions not only established the superiority of the Iranians against the Arabs but also opened the way for a belief in the "return of messiah."

This is the background of Hazrat Salman Farsi about who Shias believe that after the passing away of the prophet, besides Ahle Beit, only three Muslims were left which were Hazrat Miqdad, Harat Abu Dar and Hazrat Salman Farsi. (Some Shia traditions add two more names which are: Hazrat Ali's salve Hazrat Qmbar and Hazrat Ammar ben Yasir who supported the claim of Hazrat Ali on khilafat.)

In the passage quoted earlier from the History of Historian, it is said that though the Iranians were unable to crown those whom they wanted but they snatched the empire from Bani Umayya and handed it over to Bani Abbas who were related to the prophet. We wanted to show how the Iranians of that time weakened the Islamic state through exploitation of internal differents and splits. Hence that period of history also became our topic of discussion that how they continued their conspiracies which resulted in the transfer of empire from Bani Umayya to Bani Abbas and its collapse after the fall of Baghdad.

Imam Hassan surrenders khilafat

The Islamic empire was divided into two parts (after the assassination of Hazrat Usman), one part was under the leadership of Hazrat Ali with Kufa its capital while the other part was under Hazrat Moawiyya with capital in Damascus. After the martyrdom of Hazrat Ali, Imam Hassan succeeded him but after few days he abandoned khilafat in favor of Hazrat Moawiyya. According to Ibne Khaldun: "Imam Hassan wrote to Amir Moawiyya that he can abandon khilafat if he is given all the wealth (that was 50 million dirhams) of the treasury of Kufa. Moreover he should get the tribute (tax) of Darul Jabru (which was part of I). *(Ibne Khaldun Vol II P-456)*

After this issue was resolved, the whole empire was transferred to Hazrat Moawiyya.

Hasnain's relations with Amir Moawiyya

It is worth mentioning that both brothers enjoyed very good relations with Amir Moawiyya. For example, Allama Ibne Kaseer writes: "When the khilafat (Caliphate) of Moawiyya was established, (Hazrat) Hussain alongwith his brother (Hazrat) Hassan used to visit him. The Amir used to receive them with great honor and offered very expensive gifts. In one day they were given 200,000 dirhams. *(Al Bidaya Wal Nihaya Vol. 8)*

This relationship continued with Imam Hussain, after the death of Imam Hassan. The commentator of Nahjat Al Blagha, Ibne Abi Haddad writes: "Moawiyya was the first person in the world who gave gifts of million million dirhams and his son Yazid doubled this gift. These gifts were given to the two sons of Hazrat Ali – Imam Hassan and Imam Hussein – every year. *(Shrah Ibne Abi Haddad Vol II)*.

(To be continued)

==========